بونسائی
تسنیم کوثر

تسنیم کوثر

اِس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکادمی کا جُزوی مالی تعاون شامل ہے

نام کتاب: **بونسائی** (افسانوں کا مجموعہ)

مصنفہ: تسنیم کوثر

خوشنویس: جناب ابوالکلام عزیزی

سرورق: جناب عبدالوحید راہی

تعداد: ایک ہزار

سنِ اشاعت: دسمبر ۱۹۹۵ء۔ طبع اوّل

طباعت: لبرٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت: ایک سو روپے

BONSAI (A Collection of Short Stories)

By

TASNEEM KAUSAR

Price Rs. 100-00

تقسیم کار:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ترتیب

الف :

رفتید ولے نہ ازدلِ ما

انتساب

(۱) نانی جان (مدینہ خانم مرحومہ ۔ وصال ۱۷-۳-۱۹۹۳ء - کناڈا)

جنکے زیرسایہ میرا بچپن گذرا اور تربیت ھوئی۔

اور

(۲) خسرِ محترم (محمد ایوب مرحوم۔ وصال ۹-۲-۱۹۹۲ء حیدرنگر، پورنیہ)

کے نام

جنھوں نے میرے شوق کو سراھا اور اعلیٰ تعلیم کیلئے راہ ھموار کی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

پیش لفظ

آج سے دس پندرہ برس پہلے جب کہانیاں، افسانے، ناول وغیرہ کثرت سے پڑھے جاتے تھے اسوقت ہم اُن میں تلاش کرتے تھے اپنے آس پاس بکھرے کرداروں کو' انکی کہانی کو۔ مگر ہمیں نہایت افسوس ہوتا جب ہمیں انتہائی گنجلک کہانیاں پڑھنے کو ملتیں، وہ ایسا معمہ معلوم ہوتی تھیں جنکا حل شاید اُن کے تخلیق کاروں کے پاس بھی نہیں تھا۔ ایسے میں ہمیں بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی اور ہم نے احتجاجاً افسانے پڑھنا بند کردئے۔ مگر اضطراب کو قرار نہ دے سکے کیونکہ ہم ہی وہ قاری تھے جو کہانی سے دور ہوتے جارہے تھے اور ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ کہانیاں اپنے قاری کھوتی جارہی ہیں۔ جب ہماری بے چینی حد سے بڑھی تو ہم نے ردِ عمل کے طور پر اپنے اطراف کے کرداروں اور اُن سے جُڑے واقعات کو ماجرے کے ساتھ واضح پیرایہ میں اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کیا۔ اِس ردِ عمل کا علم جب ہمارے شوہر' **محمد انوار الحق تبسم** کو ہُوا تو اُنھیں خوشگوار حیرت ہوئی اور ہمیں اِس اقدام سے باز رکھنے کے بجائے اُنھوں نے آتش شوق کو خوب خوب ہوا دی بلکہ اِس مَیدانِ کارزار میں قلم سے تلوار کا کام لینے کی ترغیب دی۔ ہم جو باورچی خانے میں چھوٹی سی چھُری سے سبزیوں پر طبع آزمائی کرتے تھے اچانک تلوار بازی کہاں سے کرتے۔ لیکن جناب اُنھوں نے بھی جیسے قسم کھالی کہ ہمیں ادب کا سپاہی بنا کو ہی چھوڑیں گے۔ لیکن جب "من ترا حاجی بگویم تو مُرا حاجی بگو" جیسے سورماؤں سے پالا پڑا تو ہم نے بددل ہوکر میدان چھوڑ دینے کی سوچی مگر صاحب' موصُوف نے تو پیچھے ساری کشتیاں ہی جلا ڈالیں جسکے نتیجے میں یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔

انسان اور کہانی کا ازلی رشتہ ہے جو ابد تک قائم رہے گا۔ بھلے ہی انداز و اطوار بدل جائیں۔ اِس صِنفِ ادب میں نئے نئے تجربے اس کے متحرک ہونے کی دلیل ہے۔ میں بھی تجربوں کی قائل ہوں مگر اسی حد تک کہ قاری اور کہانی کا رشتہ نہ ٹوٹے۔ اور کہانی "چکرویوٗ" نہ ہو جائے جس سے نکلنے کا راستہ کہانی کار کو معلوم ہو، نہ قاری کو۔

ہر انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں جن سے گذرتے ہوئے وہ اکیلا نہیں ہوتا بلکہ آس پاس رہنے والے لوگ جنکا اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے اور وہ بھی جنکا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ظاہری یا باطنی طور پر واہ اور آہ کی حد تک اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور اُنہی میں سے کچھ حسّاس ذہن ان نشیب و فراز کے چند لمحے چُن کر کہانی کہہ جاتے ہیں۔

کہانی کہنے والا بہت مجبور انسان ہوتا ہے، اُسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا کہے اور کیسے کہے بس ایک اضطراب، ایک کرب ہوتا ہے جسے وہ اپنے علم اور مشاہدے کی بُنیاد پر لفظوں کا پیکر عطا کرتا ہے اور اس کا تخیّل مجسّم ہو کر کہانی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ہمیں بھی کہیں واقعات نے متاثر کیا اور کہیں کردار اثر انداز ہوئے مگر ہمارے تخیّل کی پرواز وہیں تک ہے جہاں پَر نہ جلیں۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

ت۔ ف

أفسانے

بونسائی

"سلمیٰ!" مراد نے آفس سے آتے ہی بیوی کو آواز دی۔ سلمیٰ بیگم باورچی خانے سے تقریباً بھاگتی ہوئی باہر کی طرف آئیں۔ "یہ دیکھو کیا لایا ہوں!" مراد بولے۔ "یہ تو برگد کا پیڑ لگتا ہے۔" سلمیٰ بیگم حیرت سے بولیں۔ "ہاں یہ برگد کا پیڑ ہی ہے، 'بونا برگد' اسے بونسائی کہتے ہیں۔"

دونوں میاں بیوی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ انہوں نے پودے کو کھڑکی کے قریب رکھ دیا۔ ہر زاویے سے وہ وہاں ٹھیک لگ رہا تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد سلمیٰ بیگم باورچی خانے میں چلی گئیں اور مُراد غسل خانے کی طرف۔ سیرامک پوٹ میں لگا بونا برگد اداس اداس تھا۔ اس کی جُھکی شاخیں سوگوار لگ رہی تھیں۔ وہ شکوہ کناں تھیں ان سے، جنہوں نے اس کے قد کو اس چھوٹے سے برتن میں قید کر دیا تھا۔ محدود خوراک نے حد بندی کر دی اور شاخوں میں لٹکائے گئے پتھروں نے انہیں آدھے رستے سے ہی مڑ جانے پر مجبور کر دیا جس کی وجہ سے وہ بونا ہو گیا تھا۔

مُراد فریش ہو کر کچن میں چلے آئے جہاں سلمیٰ چائے اور ناشتہ بنا رہی تھیں۔ "ابا جی کا کیا حال ہے؟" مُراد نے پوچھا۔ "آج اُن کے گھٹنوں میں بہت درد تھا ایک بار بھی کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ انہوں نے بتایا۔" "اچھا تم چائے لے کر وہیں آجاؤ۔" مُراد یہ کہہ کر اپنے والد کے کمرے کی طرف آ گئے۔

"السلام علیکم اباجی"۔ انہوں نے ادب سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔ "جیتے رہو بیٹے"۔ اباجی بستر سے اُٹھتے ہوئے بولے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ان کے منہ سے کئی کراہیں نکل گئیں۔ "بہت تکلیف ہے، دوا لی تھی؟" مراد پریشان ہوگئے۔ "ہاں بیٹا، دوا لی تھی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔" وہ بیٹھ چکے تھے۔ "اچھا میں کل آفس جاتے ہوئے ڈاکٹر عابد سے ملتا جاؤں گا اور سونے سے پہلے مالش کردوں گا۔ انشاء اللہ رات کو آرام کی نیند لیجئے گا"۔ مراد نے باپ کی پیٹھ تلے تکیہ لگاتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن ڈاکٹر عابد نے چیک اپ کے بعد دواؤں میں اضافہ کیا اور فوری آرام کے لئے انجکشن دیا تو اباجی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں آئے تو بونسائی پر نظر پڑی۔ "بہو! یہ تو برگد کا پیڑ لگتا ہے"۔ انہوں نے ڈسٹنگ کرتی سلمیٰ سے کہا۔ "ہاں اباجی، اسے بونسائی کہتے ہیں، سہیل کے ابو لائے ہیں"۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا۔ "اوہ تو برگد اب اس شکل میں ہوا کرے گا۔ لو اب تو پیڑ پودے بھی سینتھٹک (Synthetic) ہونے لگے۔ تنگ دامانی تو تھی ہی۔ اب تنگ زمینی بھی آگئی"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف آئے۔ کوریڈور میں سترہ سالہ پوتے سہیل سے ملاقات ہوگئی۔ "کیوں میاں! آپ کے کرکٹ میچ کا فائنل کب ہے؟" "بدھ کو دادا جان! ہماری ٹیم رانچی جارہی ہے۔ آج کل زبردست پریکٹس چل رہی ہے"۔ اس نے تفصیل سے بتایا، ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی بال اُچھالی۔ "دادا ابو کیچ ......" بوڑھے دادا بمشکل گیند پکڑ سکے۔

رات میں کھانے کی میز پر گفتگو کا موضوع بونسائی تھا۔ مراد بولے "دیکھو بیٹے بونسائی کو بہت احتیاط سے رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی دیکھ ریکھ کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔ صحیح مقدار میں اور وقت پر اسے کھاد اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی غفلت سے اس کی موت ہوجاتی ہے۔ تمہاری امی کو تو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ آج سے اس کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے، سمجھے"۔ انہوں نے اپنے آخری جملے پر زور دیا۔ "اباجی نے کھانا کھالیا؟" مراد نے بیوی سے پوچھا۔ "نہیں ابھی سوپ بننے میں دیر ہے"۔ سلمیٰ بولیں۔ "بھئی تم پہلے کیوں نہیں پکا دیتیں۔ انہیں بھوک لگی ہوگی"۔ مراد نے قدرے خفگی سے کہا۔ "میں کیا کروں سہیل سے کہا تھا شام کو بکرے کے پائے لا دینا۔ وہ ٹیوشن سے بہت دیر سے لوٹا۔ اس کے بعد لاکر دیا"۔ یہ سُن کر مراد نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور سہیل کو گھور کر دیکھا۔ "میں اباجی کے کمرے میں ہوں

میرا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی لے آیئے گا۔" مراد یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔

دن یونہی گذرتے رہے۔ کھڑکی کے قریب رکھے بونسائی اور بوڑھے اباجی کی دیکھ بھال یونہی چلتی رہی۔ اس دن آفس جانے سے پہلے مراد باپ کی خیریت دریافت کرنے آئے۔ "کیسی طبیعت ہے اباجی؟" مراد نے کھڑکیاں کھولتے ہوئے پوچھا۔ "بس یونہی ہے، اب تو بیٹھ کر نماز ادا کرنی مشکل ہوگئی ہے۔ باہر کی دنیا دیکھے تو جیسے زمانہ بیت گیا۔" وہ یاسیت سے بولے۔ "وقت پر دوا لیتے ہیں نا! آج عابد صاحب آئیں گے انجکشن لگا دیں گے تو آرام مل جائے گا۔ اب چلوں، دیر ہو رہی ہے۔ اتوار کو پارک لے چلوں گا۔" یہ کہہ کر مراد باہر آ گئے۔ چلتے چلتے سلمیٰ سے بولے۔ "بھئی ذرا بونسائی کو آنگن میں رکھ دینا۔ ہفتہ دس دن میں اسے دھوپ لگنا ضروری ہوتا ہے۔" "اچھا اب آپ جائیں، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے" سلمیٰ نے کہا اور اندر آکر وہ اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

چشمہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے تنہائی کی رفیق کتابوں نے بھی اباجی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ریڈیو بھی خراب پڑا تھا۔ سہیل کو گذرتا دیکھ کر انہوں نے آواز دی۔ "سہیل بیٹا ذرا یہاں آنا۔" "جی"۔ اس نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "یہاں آؤ میاں، آج کل کیا کر رہے ہو؟" اباجی نے پیار سے پوچھا۔ "امتحان کی تیاری چل رہی ہے، پرسوں پہلا پرچہ ہے۔ اب جاؤں؟" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیٹے ذرا میرا چشمہ بنوا دو گے؟" "کہاں دینا ہے؟" "اسٹیٹ بینک کے سامنے والی چشمے کی دکان ہے نا، بس وہیں۔" ابھی ان کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ سلمیٰ بیگم وہاں آگئیں، "سہیل تم یہاں کیا کر رہے ہو بھئی! پرسوں تمہارا امتحان ہے اور تم اِدھر اُدھر فضول وقت ضائع کرتے پھر رہے ہو۔" سلمیٰ بیگم نے بیٹے کی سرزنش کی۔ "ہاں بیٹے جاؤ، پڑھو، چشمہ پھر کبھی بن جائے گا۔" اباجی آہستہ سے بولے۔ سہیل چلا گیا۔ سلمیٰ ناشتے کے برتن سمیٹ کر جانے لگیں۔ "سلمیٰ بیٹی! ذرا آج کا اخبار تو لیتی آنا، کم از کم سرخیاں ہی پڑھ کر سنا دو۔" سلمیٰ بغیر کچھ بولے کمرے سے باہر آگئیں اور کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "افوہ، ابھی اتنے کام پڑے ہیں، اب انہیں اخبار پڑھ کر کون سنائے۔" وہ دوبارہ نہیں آئیں۔

بستر پر پڑے پڑے اباجی کو اکتاہٹ ہونے لگی۔ انہوں نے جوڑوں کے شدید درد کے باوجود خود کو کھڑکی تک لانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوگئے۔ کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گئے

اور باہر کے نظاروں سے محظوظ ہونے لگے ۔ کھڑکی کی اُس طرف سلمیٰ بیگم کا کچن گارڈن تھا ۔ پودوں میں بیگن پھلے دیکھ کر ان کا دل چاہا کہ کھٹے میٹھے بیگن کھائیں ۔ مراد کی امی بہت مزے کی پکایا کرتی تھیں ۔ پھر انہوں نے کھلے آسمان میں اُڑتے آزاد پرندوں کو حسرت سے دیکھا ۔ وہ پاؤں موڑے کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہے ۔ کمر دُکھنے لگی تو اُٹھنے لگے ۔ مگر یہ کیا ؟ ان کی تو ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں ۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ انہیں سیدھی نہیں کر پا رہے تھے تو کیا وہ شام تک وہیں بیٹھے رہیں گے ؟ انہوں نے بے بسی سے سوچا ۔ ان کا جسم پسینے سے تر ہو گیا ۔ کمر میں اور شدید درد اُٹھنے لگا ۔ انہوں نے بہو کو آواز دی مگر کوکر کی سیٹی میں ان کی صدائیں دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ گئیں ۔ اباجی کو اس چیونٹی کی کہانی یاد آئی جس نے آٹھویں کوشش میں کامیابی پائی تھی ۔ انہوں نے آخری کوشش کی اور وہ کامیاب ہو گئے ۔ ہانپتے کانپتے بستر تک آئے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کی قسم کھائی ۔ بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے ۔ طرح طرح کی بیماریاں بس بہانے تلاش کرتی ہیں ۔ بوڑھا دل بھی کسی ننھے بچے کی طرح ضدی ہو جاتا ہے ۔ من پسند چیز حاصل کرنے کے لئے مچل اُٹھتا ہے ۔ اباجی کا بھی یہی حال تھا ۔ لیکن ڈاکٹر نے روک لگا رکھی تھی ۔ یہ نہ کھائیں وہ نہ کھائیں اسپونڈیلیا ہے پرہیز کیجئے ۔ ٹھنڈک سے بچیے ۔ زیادہ نہ بیٹھیے ۔ لیکن ان کا دل چاہتا ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھائیں ۔ جی بھر کے نہائیں ۔ جبکہ ہفتہ میں ایک ہی دن مراد انہیں نہانے میں مدد کرتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ گھر میں گھومیں پھریں اور زندگی کو محسوس کریں ۔ مگر بڑھاپا اور اس پر ستم جوڑوں کے درد نے انہیں کسی قابل ہی نہ چھوڑا تھا ۔

ادھر کھڑکی کے قریب رکھا بونسائی غفلت کا شکار ہو رہا تھا ۔ سہیل نے باپ کی نصیحت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دی اور پلٹ کر اس کی خبر نہ لی ۔ سلمیٰ بیگم ہی کبھی کبھی اس میں پانی ڈال دیا کرتیں جو اسے ہرا رکھے ہوئے تھا ۔ بونے برگد کی شاخیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اس کی جڑوں کو سیرا لک پوٹ چھوٹا محسوس ہو رہا تھا ۔

اتوار چھٹی کا دن تھا ۔ مراد گھر پر تھے ۔ انہیں بونسائی کا خیال آیا ۔ دیکھا تو سہیل کی لاپروائی پر بے طرح غصہ آیا ۔ بلا کر پوچھا تو اس نے اپنے امتحان کی دہائی دی ۔ مراد نے فوراً فون کر کے پھولوں کی نرسری والے اپنے دوست کھنہ صاحب کو بلا لیا ۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بونسائی میں لگ گئے ۔ اس کی جڑوں کو

کاٹا، شاخوں کو چھانٹا اور نئی مٹی اور کھاد ڈالی۔ شاخوں کو صحیح شیپ دینے کے لئے اس میں ایک دو پتھر لٹکا کر اسے چھت پر رکھنا مناسب سمجھا۔ چلتے چلتے انہوں نے بونسائی کا خاص دھیان رکھنے کو کہا اور چلے گئے۔

ایک ہفتہ کیسے گذرا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ جمعہ تھا۔ اباجی نے سوچا نہالیں۔ درد بھی نہیں تھا اور طبیعت بھی ٹھیک لگ رہی تھی۔ وہ اپنے کپڑے لے کر کمرے سے متصل غسل خانے میں چلے آئے۔ دو دن سے کام کرنے والی نہیں آئی تھی۔ پھسلن ہو رہی تھی۔ ہینگر میں کپڑے ٹانگتے ہوئے ان کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر آرہے۔ ان کی تیز کراہ سن کر سہیل اور سلمیٰ بیگم دوڑ کر آئے۔ اباجی غسل خانے میں بے ہوش پڑے تھے۔ نتیجتاً اباجی ہاسپٹلائز ہو گئے۔ کولہا سرکنے کی وجہ سے ان کی ٹانگ کھینچ کر اس میں دو پتھر لٹکا دیئے گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بے بسی کی تصویر بنے اباجی بستر پر پڑے تھے۔ رات کو مُراد ان کے پاس رہتے۔ سہیل دن میں گھنٹے دو گھنٹے گذار کر چلا جاتا۔ آجکل اس کے کالج میں کلچرل پروگرام کی تیاریاں زوروں پر تھیں جن کے قصّے سنا کر اپنے داداجی کا جی بہلایا کرتا۔ سلمیٰ بیگم ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ بنالیا کرتیں اور خود لے کر جاتیں۔

اس دن صبح سویرے پڑوسن کے آجانے پر انہیں سخت کوفت ہوئی۔ ابھی ڈھیروں کام پڑے تھے۔ انہوں نے پڑوسن کو کچن ہی میں بلالیا اور اپنے کام نپٹانے کے ساتھ ساتھ ان سے باتیں بھی کرتی رہیں۔

"آجکل تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ کسی کو مدد کے لئے کیوں نہیں بلالیتیں؟" اکثر لوگوں کی طرح انہوں نے بھی مفت کا مشورہ دیا۔ "آپ تو جانتی ہی ہیں کہ مُراد کے چھوٹے بھائی سعودیہ میں ہیں اور بہن بھوپال میں بیاہی ہوئی ہیں۔ جو ابھی حال میں بچوں سمیت چھٹیاں گذار کر گئی ہیں۔ ان کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" سلمیٰ بولیں۔ "تو کسی اور رشتہ دار کو بلالیجئے" پڑوسن چائے کی چُسکی لیتے ہوئے بولیں۔ "رشتے دار.... بہن! خوشی کی تقریبات میں لوگ وقت نکال ہی لیتے ہیں لیکن غم میں آنے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔" سلمیٰ قدرے طنز سے بولیں۔

ہاسپٹل سے گھر واپس آنے میں کافی دن لگ گئے۔ گھر پر ہی فزیوتھریپی ہونے لگی۔ اس حادثہ نے اباجی کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ وہ چلنے پھرنے میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ زیادہ تر بستر پر ہی

پڑے رہتے۔ اس بیچ مراد کو آفس کے کام سے شہر سے باہر جانا پڑا۔ جانے سے پہلے وہ اباجی کی اداسی اور بیزاری کا احساس کرکے انہیں گھر کے سامنے والے پارک سے گھما لائے۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں مگر ابھی دھوپ باقی تھی۔ اباجی کی ضد پر انہیں چھت پر لے گئے۔ آرام دہ بستر لگوا کر انہیں بٹھایا۔ اور خود ان سے اجازت لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے انہوں نے سہیل کو ہدایت کی کہ دھوپ رہتے ہی وہ اباجی کو نیچے لے آئے۔

شام ہو چلی تھی۔ سہیل کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سلمیٰ بیگم پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھیں۔ اباجی کئی بار کہہ چکے تھے کہ وہ نیچے جانا چاہتے ہیں۔ بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہ تھا کہ بغیر سہارے کے سیڑھیاں اتر سکتے۔ سلمیٰ کو ڈر تھا کہ وہ ان کے لئے مضبوط سہارا نہیں بن سکیں گی۔ مغرب کی اذان کے بعد سہیل آیا۔ سلمیٰ نے اس کی خوب خبر لی تو وہ جھنجھلا کر بولا "تو ضرورت کیا تھی انہیں اوپر جانے کی!" ماں کی مدد سے وہ دادا کو نیچے لایا۔ سلمیٰ نے محسوس کیا کہ اباجی کا بدن تپ رہا ہے اور وہ کانپ رہے ہیں۔

دوسرے دن سے ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ تیز بخار اس پر سانس کی تکلیف۔ ڈاکٹر عابد دن میں دو بار آتے۔ مراد کے دوست ہونے کے ناطے وہ ان کے غائبانے میں اپنی ذمہ داری بحسن و خوبی نبھا رہے تھے۔ مراد سفر سے لوٹے تو باپ کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر خود کو ملامت کی۔ ان کی تیمار داری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ آفس سے اور چھٹیاں منظور نہ ہوئیں۔ البتہ اتنا ہوا کہ وہ ایک گھنٹہ پہلے آجاتے۔ سہیل، مُراد کے لوٹنے سے پہلے ہی اپنے کلاس کے لڑکوں اور ٹیچر کے ساتھ ٹور پر گیا ہوا تھا۔

مراد کے آفس چلے جانے کے بعد سلمیٰ بیگم گھر کے کاموں کے دوران ایک دو چکر اباجی کے کمرے کا لگا لیا کرتی تھیں۔ مراد نے چھوٹے بھائی اور بہن کو خبر کر دی تھی، کیونکہ اباجی کی حالت میں کوئی سدھار نہیں تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے اباجی در و دیوار کو تکا کرتے۔ کبھی کوئی چڑیا پھدک پھدک کرتی کمرے کے اندر آجاتی تو تنہائی کے سمندر میں کچھ دیر کے لئے تلاطم پیدا ہوتا، اور پھر وہی سناٹا اور اذیت ناک تنہائی۔ وہ زیادہ تر چھت میں لگے مکڑی کے اس جالے کو تکا کرتے جس میں روز ہی کوئی مکھی یا کیڑا پھنس جایا کرتا تھا۔ ان کا جی چاہتا وہ اس جالے کو نوچ پھینکیں۔

اس دن اباجی گہری نیند سے جاگے۔ سخت پیاس لگی تھی۔ سارا بدن پسینے سے شرابور تھا جیسے

لمبی مسافت طے کرکے آرہے ہوں۔ انہوں نے میز پر رکھے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو رعشہ کے باعث الٹ گیا۔ وہ حسرت سے اس بہتے پانی کو دیکھا کئے۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے بمشکل بہو کو پکارا۔ سلمیٰ غسل خانے میں تھیں۔ شاور کے شور میں ابا جی کی آواز دب گئی۔

پلانٹیشن ویک (Plantation week) منایا جا رہا تھا۔ مراد کے آفس والوں نے بھی پیڑ لگاؤ مہم چلا رکھی تھی۔ ان کی فرم کے ایم ڈی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے آفس کیمپس میں ایک پودا لگایا۔ مراد کو اپنے بونسائی کا خیال آیا۔ ہاف ڈے تھا وہ جلد گھر آ گئے۔ بریف کیس رکھ کر وہ چھت پر چلے گئے اور سلمیٰ اباجی کے کمرے کی طرف۔ بونسائی کی شاخوں میں پتھر بدستور لٹکے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ کوڑھ کے مریض کی طرح عجب انداز میں مڑ گئی تھیں۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے مٹی میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور بونا برگد سوکھ چکا تھا۔ بونسائی کی حالت زار دیکھ کر انہیں سہیل پر بہت غصہ آیا۔ ابھی وہ اپنے غصے پر قابو بھی نہ پا سکے تھے کہ نیچے سے سلمیٰ کی تیز چیخ ابھری۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور اباجی کے کمرے کی طرف دوڑے، کیونکہ آواز ادھر سے ہی آئی تھی۔ اور اندر کا منظر دیکھ کر وہ حیرت کی تصویر بن گئے۔

پانی کا جگ الٹا پڑا تھا اور اباجی پلنگ سے اتر کر غسل خانے کی طرف جانے کی کوشش میں زمین پر گر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے تھے۔ اور سلمیٰ بیگم یہ کہہ کر رو رہی تھیں۔

"ہائے اباجی!

ہائے اباجی!!"

(۱۹۹۲ء)

لوٹ پیچھے کی طرف

"اماں ..... اماں کہاں ہیں آپ ؟" شاہ زماں پرانی حویلی کے کھلے دروازے سے اندر چلے آئے۔ اونچی چھت، لمبے لمبے سائبان اور کشادہ کمروں والی پرانی حویلی گئے دنوں کی نشانی تھی۔ اس کے پھاٹک اب کھلتے اور بند ہوتے وقت کراہنے کی سی لمبی آواز پیدا کرتے تھے۔ شاہ زماں بغل میں فائل دبائے اور ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ اُٹھائے لمبا دالان عبور کر کے اماں جی کے کمرے میں آ گئے۔ وہ عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ شاہ زماں ساگوان کے بھاری بھرکم پلنگ پر بیٹھ گئے۔

اماں جی کے کمرے میں مختصر سامان تھا۔ ان کا کالے پینٹ والا بھاری بھرکم پلنگ، نماز کی چوکی، سائڈ میں رکھی لکڑی کے اسٹینڈ پر مٹی کی صراحی چاندی کے کٹورے سے ڈھکی، دیوار سے لگا ان کا پرانا لوہے کا بکس سفید کپڑے سے ڈھکا، کمرے کی دیواروں اور اس سے متعلق چیزوں پر پاکیزگی کی علامت سفید رنگ حاوی تھا۔ چھت سے لٹکتا پنکھا جو سدا ایک ہی رفتار سے گھومتا تھا۔ گرمیوں میں کھڑکی دروازے خس سے ڈھک دیئے جاتے اور اُن پر پانی چھڑکنے سے خس کی خوشبو پورے گھر میں چکراتی پھرتی۔ اماں جی کے کمرے میں عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا، سکون اور ٹھنڈک کا احساس آپ ہی آپ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا۔

امّاں جی کو سلام پھیرتا دیکھ کر شاہ زماں نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ انہوں نے اشارے سے "جیتے رہو" کہا۔ دعا کے بعد تسبیح ختم کی اور شاہ زماں پر پھونکتے ہوئے بولیں "کیا بات ہے میرے لال یہ مٹھائی کس خوشی میں ؟" شاہ زماں نماز کی چوکی تک چلے آئے اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولے "امّاں آج ہمارا کام ہو گیا، شہر کے وسط میں ہمیں زمین الاٹ ہو گئی ہے، اب ہمارے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔"

"ہیں! گویا ہمیں جانا ہی پڑے گا۔" امّاں جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اس مغالطے میں تھیں کہ شاید کوئی صورت نکل آئے اور انہیں حویلی نہ چھوڑنی پڑے۔ حالاں کہ سرکاری نوٹس تو تین مہینے پہلے ہی مل چکا تھا۔

حکومت پرانی حویلی کی جگہ ایک مارکیٹ کمپلکس بنوانا چاہتی تھی کیوں کہ یہ علاقہ بزنس پلیس تھا۔ لہٰذا مالکان کو شہر کے وسطی رہائشی علاقے میں زمین الاٹ کر دی گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد بھی گفتگو کا موضوع حویلی ہی تھا۔ "امّاں! اب تو مجبوری ہے۔ حویلی تو جلد از جلد خالی کرنی ہوگی۔" شاہ زماں دھیرے سے بولے۔

"جس حویلی نے ہماری چار پشتوں کو پروان چڑھایا ہو، جس کی دیواریں اس گھر کے مکینوں کی محبت کی امین ہوں، جس کا ذرّہ ذرّہ خلوص و وفا کی خوشبو سے مہکتا ہو اس سے جدائی کا تصور ہی میرے لیے جان لیوا ہے میرے بچّے۔" امّاں جی نے آنسوؤں سے لبریز لہجے میں کہا۔ "لیکن بیٹے اتنی جلدی ہم جائیں گے کہاں ؟" وہ کچھ فکرمند تھیں۔ "آپ پریشان نہ ہوں امّاں! میں نے اپنے دوستوں سے کہہ رکھا ہے وہ کوئی نہ کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لیں گے۔" شاہ زماں نے ڈھارس بندھائی۔

اگلے دن سے شاہ زماں نے مکان کی تلاش کا کام تیز کر دیا۔ روز گھر سے نکلتے وقت امّاں جی تاکید کرتیں "بیٹا مکان اچھا سا لیجیو مجھ سے بند کمرے میں رہا نہ جائے گا۔"

امّاں جی کو اس بڑی سی حویلی میں سب سے پیارا اپنا آنگن لگتا تھا۔ ان کے خیال میں بغیر آنگن کے کوئی مکان گھر نہیں ہوتا۔ اطراف میں بیلا، گلاب اور رات کی رانی کے پودے آنگن کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے۔ اور امّاں جی پہروں یہاں بیٹھی گزرے وقت کو یاد کرتی رہتیں۔ کبھی ایسا بھی تھا کہ ...

گرمیوں میں شام کے وقت آنگن میں چارپائیاں اور چوکیاں بچھ جاتی تھیں ۔ پکوڑے کے ساتھ شام کی چائے پی جاتی ۔ اور گپ شپ، ہنسی مذاق کا دور رات گئے تک چلتا رہتا ۔ بچے بڑے آنگن میں کوڑا جمال شاہی کھیلتے ۔ یا پھر اُسارے میں لگے موٹے کھمبوں کے پیچھے چھپا چھپی آنکھ مچولی میں تو کبھی کبھی بڑے بھی شامل ہو جاتے تھے ۔ کچھ سال پہلے جب شاہ زماں کے بڑے ابا اور چھوٹے ابا بھی اس حویلی میں رہتے تھے تو ایسا روز کا معمول تھا بلکہ حویلی میں رات تو شاید ہوتی ہی نہ تھی ۔ حویلی کا یہ بڑا سا خوبصورت آنگن تینوں گو تینوں کے میل محبت کا امین تھا ۔ جب سے دونوں دیور پاکستان شفٹ ہوئے حویلی کی رونقوں میں کمی آگئی اور پھر جب شاہ زماں کی تینوں بہنیں بیاہ کر پیا دیس سدھاریں تو حویلی پر سناٹے کا راج ہو گیا ۔ اب تو بس یہ دونوں ماں بیٹا ہی رہ گئے تھے ۔

شاہ زماں کے والد کافی عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے ۔ گاؤں میں کچھ زمینیں تھیں ۔ منشی جی سال میں ایک بار فصل دے جایا کرتے تھے ۔ خان زماں کی پنشن اوپر کے کاموں پر اُٹھ جاتی تھی ۔ شاہ کو سانس کی تکلیف نے آگے پڑھنے نہ دیا ۔ اور بھلا انٹر پاس کے لیے کون سی نوکری دھری ہے ۔

امّاں جی کے کہنے پر شاہ نے تینوں بہنوں کو آنے کے لیے خط لکھ دیئے تھے کہ آخری بار سب اس حویلی میں اکٹھے ہو جائیں ۔ یکے بعد دیگرے تینوں اپنے بچّوں اور شوہروں سمیت آگئیں ۔ ان سے اور اُن کے ننھے مُنے بچوں کی کلکاریوں سے پورا آنگن گونج اُٹھا ۔ حویلی میں رونق سی ہو گئی تھی ۔ ملبے اُسارے میں آتی جاتی اماں جی بہت خوش نظر آتی تھیں ۔ دوپہر کے وقت تینوں لڑکیاں اپنے اپنے بچّوں کو لے کر کمرے میں بند ہو گئیں تو اماں جی پھر ماضی میں کھو گئیں ۔

شاہ زماں مکان کی تلاش میں لگے تھے ۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ملتا ہی نہ تھا ۔ تھک کر گھر آتے تو جلد ہی سو جاتے ۔ بہنوں سے بھی گپ شپ کا موقع کم ہی مل پاتا تھا ۔ وقت پلک جھپکتے گزر گیا اور دوبارہ نوٹس آگیا ۔ رُقیّہ ، رضیہ اور رافعہ اپنے اپنے گھر چلی گئیں ۔

ایک دن شاہ زماں نے اطلاع دی کہ مکان مل گیا ہے اور اگلے دن شفٹ ہونا ہے ۔ اماں جی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ وہ پوری حویلی میں بولائی بولائی سی پھرتیں ۔ کبھی اس دیوار پر ہاتھ پھیرتیں تو کبھی اس کھمبے سے لگی سسکتیں ۔ گلاب کی کیاریاں سنوارتیں تو کہیں بیلے کے پودے میں پانی دینے لگتیں ۔

یہ سب کچھ بلڈوزر کے نیچے آنے والا ہے، سوچ کر ان کا کلیجہ کٹ گیا۔

آج اس آنگن میں ان کی آخری شام تھی۔ کونے میں بچھی چوکی پر بیٹھی وہ کپڑے تہہ کر رہی تھیں۔ گزرا ہوا وقت ان کی آنکھوں میں فلم کی مانند چل رہا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ ایک بار وہ آنگن میں گیہوں سکھا رہی تھیں۔ چھوٹے دیور رنگ سے بھرا مگ لیے منجھلی بہو کو تقریباً دوڑاتے ہوئے آنگن کی طرف آئے تھے۔ اور گیہوں پر پیر پڑتے ہی رنگ کا مگ لیے نیچے آرہے۔ بہو تو لانگتی پھلانگتی اُس پار جا کھڑی ہوئیں۔ اور سارا رنگ اماں جی کے سفید دوپٹے کو رنگ گیا تھا۔ دیور صاحب اور گیہوں بھی بچ نہ سکے۔

حویلی ان کے دُکھ سُکھ کی ساتھی تھی۔ اس سے بچھڑنے کا غم انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ اتنا تو وہ منجھلے اور چھوٹے دیوروں کے پاکستان جانے پر بھی نہ روئی تھیں۔ یہی وہ آنگن تھا جہاں وہ دُلہن بن کر اُتریں اور یہیں اُن کے شوہر کی لاش بھی رکھی گئی۔ یہ حویلی گواہ تھی کہ کبھی شوہر کی محبت پاش نظروں کی تاب نہ لا کر کسی کھمبے کی اوٹ لی تھی اور کبھی شدتِ غم سے دیواروں سے سر ٹکرایا تھا۔

آخر وہ وقت بھی آگیا۔ جس کا اماں جی کو قطعی انتظار نہ تھا۔ سارا سامان جا چکا تھا۔ ماں بیٹے نے آخری بار حسرت سے حویلی کے در و دیوار پر نظر ڈالی، اماں جی نے پودوں کو پانی دیا۔ شاہ زماں نے کھڑکی دروازے بند کر دیئے۔ اور سہارا دے کر اماں کو باہر لے آئے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ اس بیچ رکشہ والے نے آواز لگائی "بابو جی جلدی کیجئے۔" "چلو بیٹا" اماں جی آہستہ سے بولیں۔ پھاٹک سے دُور ہوتے ہوئے انہوں نے کئی بار مُڑ کر دیکھا۔ ان کے لیے یہ دُکھ جلاوطنی سے کم نہ تھا۔

رکشہ جب چھ منزلہ عمارت کے سامنے رُکا تو اماں جی نے بیٹھے ہی بیٹھے آنکھوں کے آگے اپنے ہاتھوں کا چھجہ بنا کر اوپر کی سمت دیکھا۔ رنگ و روغن سے چمکتی اس بلڈنگ میں اَن گنت کھڑکیاں تھیں، دو دو کھڑکیوں کے آگے تھوڑا آگے کی طرف بالکنی تھی۔ کسی میں پھولوں کے گملے رکھے تھے تو کہیں کپڑوں کی الگنی تھی۔ ان میں ٹنگے رنگ برنگ کپڑے ہوا کے دوش پر جھنڈوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

"کیا یہیں اترنا ہے؟" انہوں نے رکشے سے اترتے ہوئے بیٹے سے پوچھا۔ جو رکشے والے کو کرایہ دے رہے تھے۔ "جی اماں، وہ سامنے ہمارا فلیٹ ہے" انہوں نے عمارت کی دوسری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ اور اماں جی کو لے کر فلیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

یہ بلڈنگ ایک بیوہ عورت کی ملکیت تھی۔ اماں جی فلیٹ کا چکر لگا کر ابھی پلنگ پر بیٹھی ہی تھیں کہ وہ آ گئیں۔ شاہ زماں کھانے پینے کی اشیاء لانے بازار گئے تھے۔ " آداب! میں عالیہ خانم ہوں، اس بلڈنگ کی مالک، کہئے گھر پسند آیا؟" انہوں نے دروازے پر سے ہی اماں جی کو مخاطب کیا۔ اماں جی بستر سے اُٹھ بیٹھیں، انہوں نے عالیہ خانم کو اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا اور بولیں "گھر؟ بی بی چند دیواروں کو جوڑ کر اُوپر چھت ڈالنے سے کیا گھر بن جاتا ہے؟" عالیہ خانم کو اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی بولیں:

"بہن لگتا ہے آپ زمانے کے سرد گرم سے واقف نہیں"۔ عالیہ خانم نے طنزیہ کہا۔

"بھلا آنگن کے بغیر بھی کوئی گھر مکمل ہوتا ہے۔" اماں جی خشک لہجے میں بولیں۔

" آنگن؟ وہ کس لئے؟" عالیہ خانم نے کندھے اُچکائے۔

" لو، حویلی سے جدائی ہی کیا کم تھی کہ اب انہیں آنگن کی ضرورت اور اہمیت بتانی ہوگی"۔ اماں جی کھڑی ہونا چاہتی تھیں مگر ان کے پیر لڑکھڑائے اور وہ فرش پر گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔

شاہ زماں بازار سے لوٹے تو فلیٹ کے گرد بھیڑ دیکھ کر چونکے، راستہ بناتے ہوئے اندر آئے تو دیکھا اماں جی بے ہوش پڑی تھیں۔ اور چند عورتیں ان پر جھکی انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُلٹے قدموں بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو لے آئے۔ اماں جی کے اوسان بحال ہوئے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے جیسے تیسے کٹ رہی تھی۔ یہ فلیٹ اماں جی کو مرغی کا ڈربہ لگتا تھا۔ اور وہ پنجرے میں بند کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی تھیں۔ ایسے میں انہیں اپنا حویلی والا آنگن بہت یاد آتا تھا۔

مگر پھر عادت سی ہو گئی۔ اور اب حالات بھی تو وہ نہیں رہے تھے۔ شاہ زماں نے مایوس ہو کر نوکری کی تلاش چھوڑ دی تھی۔ کھیت بھی بھرپور فصل نہیں دے رہے تھے۔ فلیٹ کا کرایہ الگ ایک بوجھ تھا۔ لے دے کے ایک پنشن ہی رہ گئی تھی۔

پاس پڑوس سے دوستی ہو گئی تو اماں جی کا وقت اچھا کٹنے لگا۔ فلیٹ کی مالکہ بھی اماں جی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ تھوڑی دعا سلام بڑھی تو عالیہ خانم کے فلیٹ میں آنے جانے لگیں۔ ان کا جدید طرز پہ آراستہ فلیٹ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئیں۔ پوچھنے پر خانم نے بتایا کہ یہ بلڈنگ ہی ان کی کفیل

ہے ان کی دونوں بیٹیاں بھی پڑھ رہی ہیں ۔ باتوں کے دوران انہوں نے بیٹیوں کے لیے جوڑ جمع کیے گئے جہیز کی تفصیل بھی بتائی ۔ انہوں نے بیٹیوں کی شادی کا تذکرہ کیا تو اماں جی کو بھی شاہ زماں کی شادی کا خیال آیا ۔ اس کی بہنیں بھی کئی دفعہ اماں پر زور ڈال چکی تھیں ۔

آج کل شاہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں ۔ انہوں نے کچھ تو حکومت کی طرف سے ملی رقم اور کچھ اپنی آدھی زمین بیچ کر اپنے نئے مکان کی تعمیر شروع کروادی تھی ۔ وقت گزرتے دیر نہ لگی اور مکان تیار ہو گیا ۔ پانچ سال کا عرصہ کبھی تنگی اور کبھی فراغت سے گزر ہی گیا ۔ آج وہ دن آگیا تھا کہ اماں جی اپنے گھر جا رہی تھیں ۔ تمام پڑوس انہیں رخصت کرنے جمع ہو گیا تھا ۔

اپنے گھر جاتے ہوئے اماں جی اکیلی نہیں تھیں ۔ بلکہ عالیہ خانم کی چھوٹی لڑکی ثمینہ ان کی بہو کے روپ میں ساتھ تھی ۔ صبح کا وقت تھا ۔ سڑک پر زندگی تیز رفتاری سے فاصلے طے کر رہی تھی ۔ ایک دوسرے سے بے نیاز لوگ اپنے کام میں مصروف تھے ۔ منزل آنے پر اماں جی کار سے اتریں آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھجہ سا بنا کر سامنے رنگ و روغن سے چمکتی اس اونچی عمارت کو دیکھا جس کے کچھ فلیٹ آباد ہو چکے تھے وہ خاموشی سے بیٹے اور بہو کے ساتھ اندر آگئیں ۔ انہوں نے گراونڈ فلور پر رہنا پسند کیا ۔

وقت اور حالات اچھے بھلے انسان کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ پرانی شخصیت کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے ۔

آج ایک نئے کرایے دار آئے ہیں ۔ اماں جی نے سوچا مل آئیں ۔ وہ دوسری منزل پر بنے اس فلیٹ میں آگئیں ۔ آنے والوں کا سامان بے ترتیب پڑا تھا ۔ اور پلنگ پر لیٹی بوڑھی عورت بھی سامان کا حصہ لگ رہی تھی اماں جی کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں ۔ اماں جی بولیں " آداب میں بیگم زماں ہوں اس فلیٹ کی مالک ، کہیے گھر پسند آیا ؟" " گھر ؟ بہن ! چند دیواروں کو جوڑ کر اوپر چھت ڈال دینے سے کیا گھر بن جاتا ہے ۔ اس گھر کا آنگن کہاں ہے ؟" بوڑھی عورت ایک سانس میں بولی " آنگن ؟ بھلا وہ کس لیے ؟" اماں جی بولیں ۔ بوڑھی عورت لمبی سانس لے کر بے ہوش ہو چکی تھی ۔

(سنہ ۱۹۹۲ء)

مہاجر

شہر میں مہاجروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی ۔ جدھر نظر ڈالو انسان ہی انسان، ٹوٹے بکھرے، شکستہ حال قبروں جیسے انسان زرد پتوں کی طرح یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے ۔

وہ ریلیف ورک کا انچارج تھا۔ یہ ذمّہ داری اُس نے خود ہی قبول کی تھی۔ ورنہ اسے تو دوسرا ڈپارٹمنٹ سونپا گیا تھا۔ اپنے کسی ناآسودہ جذبے کی تسلّی کے لئے اس نے یہ کام سنبھالا تھا۔ وہ بہت حسّاس واقع ہوا تھا۔ مہاجروں کی حالت اسے بے حد دُکھی کردیتی۔ اور وہ سارا دن بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتا رہتا۔ ریلیف کی نئی کھیپ تیار کروانے اور اُسے مستحقین تک پہنچانے تک وہ نہایت مستعد رہتا۔ اُسے لگتا کہ کہیں دیر ہوگئی تو ......

کیوں کہ برسوں پہلے کا وہ لہولہو منظر آج بھی اس کے ذہن میں ایسے ہی تازہ تھا جیسے کل کی بات ہو۔ وہ خون آشام رات تمام تر سیاہیوں کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چلتی۔ جب وہ مہاجروں کو دیکھتا۔ وہ رات جب اس کی ماں نے وحشیوں کی وحشت کی تاب نہ لاکر اس کی آنکھوں کے سامنے دَم توڑا تھا۔ وہ خود بھی مار دیا جاتا اگر ظالم اسے مرغی کے ڈربے میں چھپا دیکھ لیتے۔ وہ بہت مشکل سے جلتے مکان میں سے اپنی جان بچاپایا تھا۔ ریلیف کیمپوں میں زخمی باپ کو تلاش کرنے میں اسے کم و بیش آٹھ دس دن لگ گئے تھے اور

ملنے کے بعد باپ کو پہچاننے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی گیا تھا۔ اُس نے تو باپ کو دیکھا۔ مگر باپ اُسے نہ دیکھ پایا۔ کیونکہ دنیا سے کوچ کیے اُسے گھنٹوں بیت چکے تھے۔

آفس کے کمرے میں کرسی پر بیٹھا وہ چھت میں لگے مکڑی کے جالوں کو تک رہا تھا کہ فون کی گھنٹی اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔ مہاجروں کی نئی کھیپ آئی تھی جن میں کئی زخمی تھے۔ اُسے تو جیسے پنکھ لگ گئے اور وہ حتی الامکان ان کی مدد کرنے میں جُٹ گیا۔ اور اُسی میں پورا دن بیت گیا۔

آج گھر لوٹنے میں اُسے دیر ہو گئی۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔ لیکن زخمیوں کی کراہیں، بے آبرو دوشیزاؤں کی پھٹی پھٹی آنکھیں، ماؤں کے واویلے، معذور کر دئے گئے باپ، یہ منظر اس کی آنکھوں میں، اس کے کانوں میں چیخنے لگے۔ تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

"بہت تھک گئے ہیں"۔ اُسے بیوی کی آواز اپنے زخم پر پھاہے جیسی لگی۔ "کھانا لگاؤں؟" وہ اس کے جوتے اُتارتے ہوئے بولی۔ "ہاں"۔ اس نے مختصراً کہا۔

کھانے کے دوران اسے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ تو وہ بولی "آج باورچی خانے کا پلاسٹر جھڑ گیا۔ شکر ہے میں وہاں نہیں تھی"۔ "اچھا چلو تو دیکھوں!" وہ پریشان ہو گیا۔

"ارے کھانا تو کھالیں" وہ پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے بولی۔

"نہیں اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو!" اُس نے بیوی کی طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ایک تم ہی تو میری اپنی ہو۔

"مگر کچھ ہوا تو نہیں نا آپ کل مالک مکان سے کہہ کر مرمت کروا دیں۔ لگے ہاتھ اس کمرے کی چھت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ مجھے تو لگتا ہے اگلی برسات نہ جھیل پائے گی۔" وہ رُک رُک کر بولی۔

"اچھا میں کل ضرور بات کروں گا۔" کھانا کھا کر وہ جلد ہی سونے چلا گیا۔

آدھی رات کو شدید پیاس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا وہ جاگ رہی ہے۔ "کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی کیا؟" اس نے پوچھا۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ایک فریم بنا رہی تھی۔ تھوڑا سا باقی ہے سوچا پورا کر لوں" وہ سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے بولی۔ "اچھا دیکھوں تو! وہ اشتیاق سے بولا۔ اس نے

فریم شوہر کی طرف بڑھادیا۔" ارے واہ تم نے تو رنگ برنگے دھاگوں سے بڑا خوبصورت گھر بنایا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔"جی ہاں اس کی چھت نہیں ٹپکتی اور نہ ہی باورچی خانے کا پلاسٹر جھڑتا ہے۔ وہ بھی مسکرائی۔ پھر گویا ہوئی۔" ہم جب اپنا گھر بنائیں گے نا تو بالکل ایسا ہی چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں، بیچ میں سُرخ بجری کی روش جو داخلی دروازے تک ہوگی۔ ہے نا!" وہ اس کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"ویسے یہ آئیڈیا تمہارے دماغ میں آیا کہاں سے؟" وہ فریم کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

سامنے والے جو نئے پڑوسی ہیں نا کشمیری ہیں ان کے ڈرائنگ روم میں ایک بڑی سی پینٹنگ ہے اس میں ہری بھری وادی کے بیچوں بیچ بہت ہی خوبصورت سا لکڑی کا مکان بنا ہوا ہے ایسے جیسے انگوٹھی میں نگ جڑا ہو، میں نے پڑوسن سے پوچھا تو کہنے لگیں کشمیر میں ہمارا ایسا ہی مکان تھا اور بولتے بولتے رو پڑیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ پھر میں چلی آئی۔"

وہ اور بھی کچھ بتا رہی تھی مگر اُسے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے اور آنکھوں کے سامنے جلتا مکان گردش کرنے لگا جو اس کے بابا نے پائی پائی جوڑ کر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔ بقیہ رات وہ کھلی آنکھوں سے جلتے منظر دیکھتا رہا۔

صبح کا سورج تمام تر تمازتوں کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ وہ بے حد مضمحل سا اُٹھا، آدھی رات سے جاگ رہا تھا اور اب تک خون آلود منظر رُوپ بدل بدل کر اُسے بے چین کر رہے تھے۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو نئے دن کے لئے تیار کیا۔

مکان مالک کو مکان کی خستگی کا احساس دلا کر جب آفس پہنچا تو ایک خبر منتظر تھی کہ ایک شخص شدید طور پر زخمی ہے مگر کسی کے قابو میں ہی نہیں آ رہا اس کے کولیگ نے بتایا کہ وہ نئے آنے والے مہاجروں میں سے ہے اور پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔ کسی کو قریب جانے ہی نہیں دیتا۔ جو کچھ ہاتھ میں آتا ہے، دے مارتا ہے۔ کسی نے بتایا بھوپال کا ہے، کوئی بولا نہیں بمبئی سے آیا ہے، کسی نے کہا گجراتی دکھتا ہے ایک تو حتمی لہجے میں بولا کہ ایک دم یو۔پی کا لگتا ہے مگر چپراسی بڑی سنجیدگی سے بولا وہ منی پور کا ہے۔ اس کا چہرہ کہتا ہے۔ ابھی وہ انہی قیاس آرائیوں کے بیچ غوطہ زن تھا کہ ایک شور بلند ہوا پکڑو.... پکڑو....

وہ کمرے سے باہر نکلا۔ سامنے ہی کچھ لوگ ایک بوڑھی عورت کے گرد جمع نظر آئے۔ وہ قریب گیا تو

پتہ چلا کہ بڑھیا بے ہوش ہے اور سسٹر جاریا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس نے پوچھا ہوا کیا؟ ڈاکٹر راج نے بتایا کہ آتنک وادیوں نے بڑھیا کے خاندان والوں کو مار ڈالا اور مکان کو آگ لگا دی۔ اس کی آنکھوں نے ایسے ہولناک منظر دیکھے جس نے اسے حواس باختہ بنا دیا۔ "لیکن ابھی کیا ہوا؟" ڈاکٹر راج کے چپ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ "بڑھیا کے پاس اور تو کوئی سامان نہ تھا بس ایک فوٹو تھی، وہ بھی کسی مکان کی جسے وہ ہر وقت سینے سے لگائے رہتی تھی۔" "کچھ پتہ چلا یہ کہاں کی ہے؟" اس نے بیچ میں ہی پوچھا۔ "جب آئی تھی تو لباس دوسرا پہنے تھی۔ چہرے مہرے اور لباس سے کشمیری لگتی تھی۔" "یہ بے ہوش کیسے ہو گئی؟" اس نے سابقہ سوال دہرایا۔ "وہی تو بتا رہا ہوں۔ اس بڑھیا کے مکان والا فوٹو وہ لے بھاگا ہے۔" ڈاکٹر راج نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا "کون؟" اس نے پوچھا۔ "وہی پاگل جو کل ریفیوجیز کی نئی کیمپ میں آیا ہے۔" ڈاکٹر راج کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ بڑھیا کو ہوش آ گیا۔ اس نے آس پاس شاید تصویر کو تلاش کیا اور نہ پا کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

بڑھیا کی بتدریج بگڑتی حالت دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ تصویر کا ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ چپراسی کو ساتھ لئے کیمپ سے باہر نکل آیا۔ اس نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑائے مگر وہ پاگل نہ ملا۔ اب وہ خود چپراسی کو ساتھ لئے ڈاک بنگلہ چوراہے کی طرف بڑھ گیا۔ کافی دور چلنے کے بعد بھی وہ کہیں نظر نہ آیا۔ لوگوں کا ہجوم، ٹریفک کا اژدھام۔ بھلا وہ ملتا بھی کیسے۔ اب وہ مایوس ہو کر اس ارادے سے لوٹا کہ بازار سے کوئی پوسٹر خرید لے گا، جس پر کوئی مکان بنا ہوا ہو۔ شاید یہی بڑھیا کے دکھ کا مداوا ہو۔ لیکن اس کے مڑتے ہی چپراسی چلایا۔ "وہ رہا سر" وہ دیکھئے ٹریفک پولیس والے چبوترے پر بیٹھا ہے۔" اس نے دیکھا بے شک وہ وہی تھا۔ اتنی تلاش کے بعد وہ ملا بھی تو بیچ چوراہے پر۔ وہ چبوترے پر بیٹھا بڑے مزے سے فوٹو نہار رہا تھا۔ اس کے پپڑی جمے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں کے بیچ جلد سے جلد روڈ کراس کرنے میں وہ دونوں کئی بار حادثے سے بچے مگر اسکے قریب پہنچ ہی گئے۔ وہ چونکنا ہو گیا۔ اور متوحش سا روڈ پر اتر گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "نہیں، نہیں ادھر مت جانا۔ ہم کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن وہ حد درجہ خوف زدہ تھا اور پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ گھوم کر دوڑنے لگا۔ اور مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی سے اسے دھکا لگا۔

وہ کوئی سُرخ بتی والی گاڑی تھی، جو اُسے چیونٹی کی طرح مسلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے ہاتھ سے تصویر چھٹک کر دور جاگری۔ جس پر بنے گھر کی دیواریں دیوالی پر ہونے والے رنگ و روغن کی مانند اس کے خون سے رنگ گئیں۔ یہ دردناک منظر اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کرگیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو خود کو اپنے بیڈروم میں پایا۔ سامنے ہی دیوار پر اس کی بیوی کا خواب فریم میں جڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے لپک کر اُسے سینے سے چمٹا لیا اور بار بار ایک ہی جملہ دہرانے لگا۔

"میں اسے نہیں جلنے دوں گا۔"

"میں اسے نہیں جلنے دوں گا۔"

(۱۹۹۳ء)

انوکھا رشتہ

وہ سارے گاؤں کی دادی تھی۔ منہ میں دانت نہیں تھے۔ اس لئے سب اسے پوپلی کہتے تھے۔ وہ دو بیٹوں اور آٹھ بیٹیوں کی ماں تھی۔ اس کے آس پاس سگے کہلانے والوں کا ہجوم تھا۔ اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو نہ صرف بڑے ارمان سے بلکہ بہت جتن سے شہر کے بڑے مدرسہ میں عالم و فاضل کی ڈگری حاصل کرنے بھیجا۔ بیٹے کو پردیس میں تکلیف نہ ہو' اس لئے ہر مہینے باقاعدگی سے چار سو روپے منی آرڈر کر دیا کرتی تھی۔ گرچہ اسے ان روپیوں کے لئے کڑی محنت و مشقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا' مگر بیٹے کے بہتر مستقبل کی اُمید میں وہ اِن تکلیفوں کو ہنسی خوشی سہہ لیتی جو اسے دوسروں کا دھان اوکھلی میں کُوٹ کُوٹ کر چاول بنانے میں جھیلنی پڑتی تھی۔ اس پر ستم یہ تھا کہ وہ یہ کام کُھلے عام نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے نام کے ساتھ اعلیٰ خاندان جڑا ہوا تھا اور خاندانی لوگوں کا یہ کام نہ تھا کہ وہ دوسروں کے کام کریں۔ جب کبھی رقم پوری نہ ہوتی تھی تو وہ مرغے مرغیاں، بکرے بکریاں، انڈے جوڑے بیچ کر، مگر وقت پر بیٹے کے لئے روپے منی آرڈر کر دیا کرتی تھی۔

پوپلی کا چھوٹا بیٹا پڑھنے لکھنے کے نام سے ہی بدکتا تھا۔ اس لئے پوپلی نے مار پیٹ کر گاؤں کے اسکول میں بھیجنے کے بجائے اسے جانوروں اور ان پودوں کی دیکھ بھال میں لگا دیا جو اُس نے اپنی اگلی نسل

کے لئے پھلوں کی آس میں لگائے تھے۔ مگر پیڑوں کے پھلنے سے پہلے ہی چھوٹے بیٹے نے لکڑی کا کاروبار کرنے کا ارادہ کیا اور انہی نوخیز پیڑوں کو کاٹ کر جو اس کے ساتھ ساتھ پلے بڑھے تھے' اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ پوپلی نے احتجاج کیا تو اس نے کڑے لفظوں میں کہا ــــ "بڑکا بیٹا کہ سہر بھیجلے۔ چار سو ٹکا ہر مہینہ دیلہین ہمنے کچھو بولہان۔ آب کا چھوٹنا اوکرہے دیویہن کی؟" (بڑے بیٹے کو شہر بھیجا چار سو روپیہ ہر مہینہ دیا ہم نے کچھ کہا۔ اب سارے پیڑ بھی اسے ہی دوگی؟)

بڑا بیٹا تعلیم مکمل کر کے لوٹ آیا اور گاؤں کے مدرسہ میں معلّم ہوگیا۔ گاؤں والے اسے" مولبی صاب" کہہ کر بلانے لگے تو پوپلی کو لگا اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ پوپلی کی بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں مگر آٹھویں یعنی سب سے چھوٹی کو بیاہنے میں اسے سو جتن کرنے پڑے' کیونکہ اب وہ زمانہ تو تھا نہیں کہ لڑکے کو گھڑی سائیکل ملی تو انور زیسوں میں سمدھیانہ ہوا۔ اب تو ان چیزوں کے علاوہ گرم اور ٹھنڈا سوٹ' ریڈیو' ٹی وی' گائے بھینس اور فرنیچر بھی۔ ہاں شیشم کی لکڑی کا نہیں تو آم کا ہی سہی۔

چھوٹی بیٹی کو بیاہنے کے لئے جب پوپلی نے بچی کھچی زمین میں سے کچھ کو بیچنے کی بات کی تو بڑی بہو نے ناطقہ بند کر دیا اور مولوی صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا حصہ لے کر الگ ہوگئے۔ چھوٹے نے بھی اپنے حصے کی نہ صرف زمین الگ کر لی بلکہ چولہا چکی بھی الگ کر لیا۔ ان کے خیال میں اب تم جانو تمہارا کام جانے۔ دور اندیشی کے تحت پوپلی نے اپنے بھائی کی بیٹی کو چھوٹی بہو بنایا تھا۔ اس کے خیال میں اپنے تو آخر اپنے ہی ہوتے ہیں۔ مگر جب پھوپھی ساس بن گئی تو بھتیجی کے رشتے نے کفن اوڑھ لیا۔

ایسا نہ تھا کہ پوپلی ہمیشہ سے پوپلی تھی۔ خیر سے کبھی پورے دانت ہوا کرتے تھے موتیوں جیسے۔ اس کا نام زیب النساء تھا۔ زیبو ایک بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ ماں باپ نے منت مرادوں سے حاصل بیٹی کی بڑی اللہ آمین سے پرورش کی تھی۔ گاؤں کے دوسرے صاحب حیثیت لوگوں کی طرح ان کی بھی سب سے بڑی تمنا تھی کہ ان کی بیٹی کسی اونچے زمیندار گھرانے میں بیاہی جائے۔ گاؤں کی روایت کے مطابق لڑکی کا تیرہواں سال لگتے ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ سو زیبو کے بھی کئی رشتے آرہے تھے۔ آخرکار بہت سوچ بچار کر انہوں نے سرولی کے حاجی صاحب کے لڑکے سے جو سات سو بیگھہ کھیتوں کا اکیلا وارث تھا' اس کی شادی کر دی۔ پتلی دبلی زیبو کے اُبٹن کی رسم کے وقت اس کی دادی نے مذاقاً کہا تھا... " گے کنیا تورسیں تہ ٹیلہوا چھی۔"

(اری دلہن تیرا دلہا تو بدھو ہے) ۔

اسے کیا پتہ تھا کہ یہ مذاق نہیں حقیقت ہے کہ اس کا شوہر گرچہ ہے تو بڑا زمیندار مگر اس کی عقل اس کی عمر سے چھوٹی ہے ۔ اور بڑے گھروں میں یہ کوئی عیب نہیں ۔ زیبو کو نیا گھر نئے لوگ بہت اچھے لگے ۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ کام نہ دھام، خالی اچھل کود، ناز نخرے لیکن زیادہ دن بھی نہ گذرے ادھر اس کا پاؤں بھاری ہوا اُدھر سسر چل بسے ۔ ساس تو پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں ۔ شوہر کو اتنی عقل ہی نہ تھی کہ وہ پھیلے ہوئے کاروبار کو سنبھال پاتا ۔ سو رشتہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور حالات کے پے در پے تھپیڑوں نے اسے نڈھال کر دیا ۔ کھیت کہاں گئے کچھ پتہ نہ چلا ۔ کھاتہ کھلیان دیکھنے والا منشی بابو کہلانے لگا اور بابو صاحب "ٹیلھو اقدیر" ۔ پختہ مکان موسم کے سرد و گرم کا شکار ہو کر منہدم ہونے لگا تو اسے پھوس کے کچے گھر میں اُٹھ آنا پڑا ۔ یکے بعد دیگرے اس کے بچوں کے ساتھ ساتھ اس کی مصیبتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ وہ سب کچھ سہتی رہی ۔ بدن پر ریشمی ساڑی کے بجائے پاڑ والی دھوتی نظر آنے لگی ۔ اوپری تن ڈھانپنے کے لئے کُرتی ہو نہ ہو اب اسے کوئی فرق نہ پڑتا ۔ سر کے بال گھِس کر بالشت بھر ہی رہ گئے تھے ۔ چپل نے تو جانے کب اس کا ساتھ چھوڑا تھا اب اسے یاد بھی نہیں تھا ۔ چھوٹی بیٹی بہت چھوٹی تھی جب قدیر اللہ کو پیارا ہو گیا اور زیب النساء کو دکھوں کے ہجوم میں تنہا چھوڑ گیا ۔ خاندان کے نام کی لاج رکھتے ہوئے اسے اپنے ان جگر گوشوں کی پرورش کرنی تھی جو اس کے جسم کا ہی حصہ تھے ۔ اب تو دُکھ سُکھ کے سارے موسم اس کے لئے ایک رنگ کے ہو گئے تھے ۔

مرغیاں، بکریاں بیچ کر بڑے لڑکے کو پڑھایا ۔ زمینیں گروی رکھ کر بیٹیوں کی شادیاں کیں جو وقت پر سود سمیت اصل رقم ادا نہ ہونے پر ان ہی کی ہو رہیں جن کے پاس گروی تھیں ۔ بس اب تو اس کے دین مہر کی وہ زمینیں ہی باقی تھیں جو حاجی صاحب زندہ رہتے اس کے نام لکھ گئے تھے مگر اس میں سے بھی دونوں بیٹے اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے ۔ اب وہ تھی اور اس کی چھوٹی بیٹی جو کیلے کے پیڑ کی طرح بڑھ گئی تھی اور وہ دیکھتی رہ گئی ۔ اس کی عمر بیئیس برس سے تجاوز کر گئی وہ روک نہ سکی ۔ کسی طرح گاؤں کے مزدور پیشہ طبقے کے ایک لڑکے سے بیاہ دیا ۔ انہیں بھی اعلیٰ خاندان میں رشتے داری کیا ملی مانو قارون کا خزانہ مل گیا ۔

زیب النساء نے بیٹیاں بیاہیں وہ اپنے اپنے گھر کی ہو رہیں ۔ بیٹے بیاہے وہ اپنی اپنی بیوی کے

ہو رہے ۔ کتنے ہی ماہ و سال حالات کی چکّی میں پستے گذر گئے ۔ وقت نے اس کے بدن پر جھرّیوں کی شکل میں گہری سلوٹیں ڈال دیں ۔ دانتوں نے ساتھ چھوڑا تو وہ پوپلی ہوگئی اور کب سارے گاؤں کی پوپلی دادی ہوئی کسی نے دھیان نہ دیا ۔ وقت نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انسانی رشتے کچے دھاگے ہوتے ہیں جو غرض کے بندھن سے بندھے ہوتے ہیں اور جلد ہی ٹوٹ بھی جاتے ہیں ۔ انسانی رشتوں سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا ۔ اسے لگا جیسے اس کے بے زبان جانور ہی اس کے سچے غمخوار ہیں جو آڑے وقت کام تو آتے ہیں ۔ مگر اب تو اس کے پاس مرغی کا ایک بچہ تک نہ تھا ۔

ایسے میں بھولو اس کی زندگی میں اُس عصا کی طرح داخل ہوا جس کے سہارے وہ باقی عمر کم سے کم چل پھر سکتی تھی ۔ بھولو بڑا پیارا اُجلا اُجلا ایک بکری کا بچہ تھا ۔ پوپلی کی چھوٹی بیٹی دے گئی تھی ، کیونکہ بکری ایک ساتھ تین بچوں کو جنم دے کر مرگئی تھی ۔ پوپلی نے بڑے پیار سے اس کا نام "بھولو" رکھا اور اس کی دیکھ بھال میں ایسی مصروف ہوگئی جیسے وہ اس کا تیسرا بیٹا ہو ۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے پوپلی اور بھولو ایک جان دو قالب ہوں ۔

دادی پوپلی کو اس کے اپنوں نے کوئی ناکارہ شئے سمجھ کر خود سے الگ کر رکھا تھا ۔ مگر ضرورت پڑنے پر سب ہی اسے اس کا فرض یاد دلایا کرتے تھے ، سو دادی اپنے پوتے پوتیوں کی پیدائش سے لے کر ان کے پاؤں پاؤں چلنے اور آب دست خود کر لینے کی عمر تک ایک پاؤں پر کھڑی رہتی ۔ اس کے عوض اتنا ہوتا کہ اسکے بیٹے زکوٰۃ فطرے وغیرہ کی رقم کسی اور کو دینے کے بجائے اسے ہی دے دیا کرتے ۔ کیونکہ ان کی نظر میں اس سے زیادہ مستحق اور کوئی تھا بھی نہیں ۔ یوں ع "رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے مصداق دین و دنیا دونوں سنوار لیتے ۔

پوپلی سارے گاؤں کے لئے چلتا پھرتا کارپوریشن تھی ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اس کے پیٹ بھرنے کا ذریعہ بھی تھا ۔ کسی کی شادی ہو یا ولیمہ ، کسی کا پاؤں بھاری ہو یا کسی کا چھلّا ، پوپلی ان سب میں پیش پیش رہتی ۔ خاص طور پر زچہ و بچہ کی دیکھ بھال کے لئے چھ دن تک پوپلی کا رہنا ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ گاؤں کے انسان ہی نہیں جانور بھی اس کے محتاج تھے ۔ کیونکہ وہ ان سب کے لئے جڑی بوٹیوں کا سہی مگر فرسٹ ایڈ تو مہیا کر ہی دیتی تھی ۔ بدھیا کی گائے کم دودھ دیتی ہو یا رام دیال کا بیل بیمار ہو ، پوپلی خدمت میں حاضر ۔

اس نے خود کو گاؤں کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور یہی اس کے لئے باعثِ سکون تھا۔

اس دن وہ آٹا پل کے دروازے سے لگی جھر جھر روئے جا رہی تھی۔ لوگ بار بار پوچھ رہے تھے "کی بھیلی ہے؟" (کیا ہوا؟) وہ کچھ بتا بھی رہی تھی مگر پوپلے منہ اور بھرائی آواز کی وجہ سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جھولتی رسّی دیکھ کر کچھ لوگوں نے اٹکل لگائی شاید بھولو کھو گیا ہے۔ اور بات تھی بھی یہی۔ گاؤں کے کچھ نیم برہنہ بچے اِدھر اُدھر تلاش کر آئے مگر بھولو ہوتا تو ملتا نا! گیہوں پسوا نے آئے سوہن بنئے نے بتایا کہ اس نے بھولو کو آج صبح زبیدہ کے کھیت میں دیکھا تھا۔

زبیدہ شہر سے نرسنگ کا کورس کرکے آئی تھی۔ مگر پوپلی کے رہتے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ اسے پوپلی سے ذاتی پرخاش تھی۔ اور آج اس کی رقیب روسیاہ کا لاڈلا اس کے کھیت میں پھولی ہوئی سرسوں میں منہ مارتا پھر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی جان ہی تو جل گئی۔ وہ جھٹ بھولو کے گلے میں رسی ڈال کر اسے "اڈگر" پہنچا آئی جہاں قصوروار جانوروں پر جرمانہ ہوتا تھا۔ گاؤں سے دو کوس دور حیدر نگر میں اڈگر تھا جہاں کا پردھان بڑا ہی سخت آدمی تھا اور جرمانہ وصولنے کے بعد ہی جانوروں کو مالکان کے حوالے کرتا تھا۔

پوپلی نے جب یہ سنا کہ بھولو زبیدہ کے کھیت میں تھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اپنی میلی ساڑی جھاڑ کر کھڑی ہوگئی، بکھرے بالوں کا جوڑا بنایا جو پھر کھل گیا۔ غصہ میں بڑبڑاتی اپنی خمیدہ کمر پر ہاتھ رکھے لاٹھی ٹیکتے ہوئے زبیدہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ کچھ نیم عریاں بچے ساتھ ہو لئے جن میں سے زیادہ تر چرواہے تھے اور کچھ عورتیں جو گیہوں پسوانے آئی تھیں اور خود کو پوپلی کا ہمدرد بتاتی تھیں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

زبیدہ سے جھگڑے کے دوران جب پوپلی کو پتہ چلا کہ بھولو کو اڈگر پہنچا دیا گیا ہے تو اس نے زبیدہ پر گالیوں اور کوسنوں کی بارش کردی۔ جب وہ مضمحل سی گھر لوٹی تو اسے ایک ہی فکر تھی کہ جرمانے کی رقم کہاں سے لائے گی۔ وہ مرے مرے قدم بڑھاتی مولوی صاحب کے گھر کے اُسارے میں گڑے کھمبے سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ بھولو کے گلے کی گھنگھرو لگی ڈور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ مولوی صاحب مدرسہ سے لوٹے تو ماں کو منتظر پایا۔ عقلمند تو تھے ہی فوراً سمجھ گئے، کوئی ضرورت آن پڑی ہے۔ آتے ہی پوچھا... "کی گے میاں کی بات چھی؟" (کیا بات ہے ماں؟)

"زبیدیا بھولو کے اڈگر کری دیلکی چھے۔" (زبیدہ نے بھولو کو اڈگر پہنچا دیا ہے) پوپلی دادی بھرآئی ہوئی آواز میں بولی۔

"دوسرا کَ کھیت اجاڑے لی اپنوں دُلاروا کے آجاد چھوڑی دیو ہین تہ وہ پکڑتے نئے کی؟"
وہ غصے سے بولے۔

(دوسرے کا کھیت اُجاڑنے کے لئے اپنے دلارے کو آزاد چھوڑو گی تو وہ پکڑے گی نہیں؟)

پوپلی ہمت جٹا کر بولی "اے ہو بچیس ٹہ ٹکا دیو ہیا، جرمانہ بھرے لی بیٹا۔"

مولوی صاحب تاجرانہ انداز میں بولے "دیوؤ تہ کھستی ٹہ ہمرا دیوے ؟" (دو دنگا مگر بکرا مجھے دو گی؟)
بیٹے سے بکرے کے سودے کی بات سن کر پوپلی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے بیٹے کو بچپن سے لے کر ان کے مولوی بننے تک کا حساب و کتاب سنا کر رکھ دیا۔ بیٹا بھی چُپ نہ رہا اور آخری بات کے طور پر کہہ گیا کہ وہ بھی دیکھے گا کہ بڑھیا کو کفن کون دیتا ہے۔ یہ بات پوپلی کا کلیجہ چیر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کے انداز میں اسارے سے اُتری تو اس کا پاؤں آنگن میں پڑے کُھلے ہوئے ہنسیے پر جا پڑا جو اُس کی بڑی بہو کی لاپروائی کے باعث آنگن میں پڑا رہ گیا تھا۔ 'کھچ' کی آواز ہوئی اور ہنسیے کی تیز دھار نے اس کا تلوا خربوزے کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ خون کی تیز دھار بہہ نکلی۔ پر پوپلی کو اس کی پرواہ کب تھی اسے تو فکر تھی بھولو کی، جانے کس حال میں ہوگا۔ اس نے مُٹھی بھر مٹی زخم پر تھوپ لی اور جرمانے کی رقم جٹانے کے اُپائے سوچنے لگی۔

اسے چھوٹی بہو کا خیال آیا۔ وہ تو اس کے بھائی کی بیٹی ہے۔ آڑے وقت میں بھلا وہ نہیں تو اور کون کام آئے گا؟ یہ سوچ کر وہ پورب کی طرف باورچی خانے چلی آئی۔ چھوٹی بہو چولہا سُلگا رہی تھی، سمجھی شاید بڑھیا کھانا مانگنے آئی ہے۔ ماتھے پر پڑی سلوٹیں گہری ہوگئیں۔ پوپلی نے لب کھولے اور دھیرے سے کہا "گے بیٹی بچیس ٹہ ٹکا دیوے؟" "کا ...." بہو نے کھینچ کر کہا۔ "کیبتھی لی" (کاہے کو) اس نے دھوئیں کی وجہ سے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"بھولو کہ اڈگرا سے چھڑادے لی۔" پوپلی نے گیلی لکڑیوں پر پھونک ماری اور وضاحت کی یہ سن کر بہو کا پارہ چڑھ گیا۔

"ہوں کہنے دیہے بھولوا لی ٹکاردیوی، حرمجاداکیل گہم کھئے، ِلکلی پُرسی دال کَ ہانڈی اُنٹیے دِکلی مَرَے دَھک"۔

(کیوں، اسی بھولو کے لئے روپیہ دوں، حرام زادہ کل گیہوں کھاگیا، پرسوں دال کی ہانڈی اُلٹ دی، مَرنے دو) چھوٹی بہو جیسے پھٹ پڑی تھی۔ پوپلی نے مایوسی سے گردن ہلائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

شام ہو چکی تھی۔ پوپلی کے زخم سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا بدن تیز بخار کی زد میں ہے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ پوپلی سرِشام ہی اپنی سیل زدہ کوٹھری میں جا سوئی اور کسے فرصت تھی جو اس کا حال پوچھتا۔

ابھی سورج کی کرنیں املتاس کی سب سے اونچی شاخ میں اٹکی تھیں۔ چرواہے بھینسوں کو شبنم سے بھیگی گھاس کھلاکر لوٹ رہے تھے۔ ہلواہوں نے ابھی ہل نہیں اُٹھائے تھے، گرہستنوں نے ابھی ابھی چولہے کے پاس جلاون رکھا تھا کہ خبر ملی پوپلی دادی مرگئی۔

دن ڈھلتے ڈھلتے مولوی صاحب کا آنگن بلاتفریق رنگ ونسل لوگوں سے کھچا کھچ بھرگیا۔ رام دیال نے شردھا سُمن کے طور پر پوپلی کے جان سے پیارے بھولو کو اڈگرے چھڑالیا اور مولوی صاحب کے حوالہ کر دیا۔ دور دراز کے رشتہ داروں کو خبر کی جاچکی تھی۔ یکے بعد دیگرے پوپلی کی منجھلی، سنجھلی اور چھوٹی سمیت سات بیٹیاں آچکی تھیں۔ ان کے ننھے منے ملڈی دَل اُن کے ساتھ تھے۔ بس ایک زہرہ ہی باقی تھی۔ پوپلی کی سب سے بڑی لڑکی زہرہ جو خود پوتے پوتیوں والی تھی۔

کفن دفن کا انتظام مولوی صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ بھولو کے بدلے جُمّن قصائی ایک کلو گوشت اور دوسو روپئے نقد دے گیا تھا۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ زیب النساء اُجلے کفن میں ملبوس پابہ رکاب تھی مگر سب منتظر تھے زہرہ کے۔

لوگوں نے دیکھا زہرہ ہانپتی کانپتی چلی آرہی ہے۔ اس کے کندھے پر شاید اس کا پوتا سوار ہے۔ قریب پہنچی تو پتہ چلا وہ اس کا پوتا نہیں بلکہ اُجلا اُجلا پیارا سا اک بکری کا بچہ ہے۔

(۱۹۹۳ء)

دیواریں

دس سال بعد ہم وطن لوٹ رہے تھے ۔ میں ، میرا شوہر اور دونوں بچّے بے حد خوش تھے ۔ ہم نے جب وطن کو خیر باد کہا تھا اس وقت میری نئی نئی شادی ہوئی تھی ۔

میری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی ۔ بارات مختصر تھی اور اندرون سندھ سے آئی تھی ۔ کچّے پکّے راستوں سے گذر کر بارات جب شہر پہنچی تو سارے باراتی دھول اور مٹی سے اَٹے تھے ۔ مگر میرے گھر والوں نے بہت بہتر انتظام کر رکھا تھا ۔ سارے باراتی آدھے گھنٹے ہی میں تازہ دم ہو گئے ۔ بزرگوں نے روایتی انداز کے کپڑوں کے ساتھ سر پر شاندار پگڑی سجا رکھی تھی ۔ لڑکوں نے قمیص شلوار پر اسی مناسبت سے شیشے کی کڑھائی کی ہوئی واسکٹ اور سندھی ٹوپیاں ، جو پیشانی کے پاس اُلٹے چاند کی شکل میں کٹی ہوئی تھیں ، پہن رکھی تھیں ۔ ان کے یہاں بارات میں عورتوں کا جانا ممنوع تھا ۔ مگر جہاں اور بہت رواجوں کو توڑا گیا وہاں میری عزیز از جان سہیلی تاجور نے سب کی ناراضگی مول لے کر بارات میں شرکت کی ۔

تاجور اور اس کا بھائی ہمارے پڑوس میں اپنے ماموں کے گھر رہ کر کراچی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ میں اور تاجور سر سید گرلز کالج میں انٹر کی طالبہ تھیں ۔ ہم میں اتنی دوستی تھی کہ بس رات کو سونے کے لئے الگ ہوا کرتے ۔ کچھ عرصے بعد ایک دن تاجور نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ ادّا انور تمہیں پسند کرتا ہے ۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔میں نے خود کو ٹٹولا تو پایا کہ انور کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے بیچ یہ جذبات اچانک ہی اُمڈ پڑے تھے۔ اس کا احساس مجھے پہلی بار اس وقت ہوا تھا جب بڑے بھیا، بھابھی اور چھوٹے بھائی بہن کے ہمراہ میں، تاجور اور انور پکنک منانے کراچی سے میلوں دور 'نیلم پوائنٹ' گئے تھے۔ فوٹو گرافی کا کام انور کے سپرد تھا۔ وہاں کے نظاروں سے محظوظ ہونے کے بعد ہم لوگ جلد ہی واپس ہو گئے کیونکہ واپسی میں ٹھٹھہ میں بھی رُکنا تھا۔ ٹھٹھہ کی سو گنبد والی مسجد میں نماز ادا کر کے دونوں بھائی وہیں رُک گئے اور ہم شہر خموشاں کی طرف چل پڑے۔ مکلی کے قبرستان پہنچنے پر بھابھی، چھوٹی بہن باہر ہی رُک گئیں اور کھانے پینے کا انتظام کرنے لگیں۔ میں اور انور ہی اندھے کنوئیں تک ہو آئے۔ قبرستان میں گہرا سناٹا تھا۔ ابدی نیند سونے والوں کی خاموشی میں اگر کوئی بول رہا تھا تو وہ انور تھا وہ مجھے سسّی پنوں کی لوک کتھا سنا رہا تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کئی اشعار جو اسے ازبر تھے رُلتے بھر مجھے سناتا رہا۔ میں رو کھی ہی رہ گئی مگر اس نے میری کئی تصویریں لے ڈالیں۔

واپس آئے تو بھیا آ چکے تھے۔ بابا بھُلّے شاہ کا مزار قریب ہی تھا۔ ہم چل پڑے۔ یہاں منت مرادوں کے مانگنے والوں کا ہجوم تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم نے فاتحہ پڑھی۔ وہاں موجود سحر زدہ آسیبی نیم پاگل نوجوان لڑکیوں کی حالت دیکھ کر ہم زیادہ دیر نہیں رک سکے اور واپسی کے لئے چل پڑے۔ کیونکہ شام اتر رہی تھی اور ہمیں دور جانا تھا۔

کچھ دنوں بعد انور کے پیہم اصرار پر ابّو کی اجازت سے میں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کے ہمراہ ان کے گاؤں گئی۔ اس کے گھر والے خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ تاجور اور انور دو ہی بھائی بہن تھے۔ ان کے والد گاؤں کے بڑے معزز آدمی تھے۔ گاؤں کے لوگ بے حد ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ کسی کے گھر چائے، کسی کے یہاں ناشتہ اور انور کے پڑوسی چودھری انکل کے گھر کھانے کی دعوت ہوئی۔ ہم لوگ ان کے خلوص و محبت کا قائل ہو گئے۔ اس بیچ کئی ایسے مواقع آئے جب میں انور کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا گھبرا گئی۔ ایک ہفتے بعد ہم لوٹ آئے۔

کچھ دنوں بعد انور کے والدین ہمارے گھر آئے اور انہوں نے ابّو سے انور کے لئے میرے

رشتے کی بات کی۔ ابّو کو کوئی اعتراض نہ تھا بشرطیکہ میں اسے منظور کرلوں۔ امّی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس معاملے کو والدین کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے اسے میری حامی سمجھ کر ایک سادہ سی تقریب میں میری منگنی انور کے ساتھ کردی۔

وہ لوگ پھر گاؤں چلے گئے والدین لاڈلی اولاد کی ضد کے آگے تو مجبور ہو گئے تھے مگر انہیں مشکلات کا سامنا تھا کیونکہ ان کے یہاں برادری سے باہر شادیاں نہیں ہوتی تھیں اور پسند کے سوال پر تو اگر لڑکیوں کا معاملہ ہو تو وہ اپنی بیٹیوں کے ٹکڑے کر دینا بہتر سمجھتے تھے مگر بیٹوں کے سلسلے میں تھوڑی لچک تھی سو انور کے والدین نے مجھے کشادہ دلی سے قبول کرلیا۔ میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ انور میں کوئی کمی نہ تھی۔

پھر بڑے دھوم دھام سے ہماری شادی ہوگئی۔ بڑے بھیا جرمنی میں ملازمت کرتے تھے ان کی وساطت سے انور کو بھی وہاں ایک اچھی سی نوکری مل گئی۔ ہمیں دس سال کا بونڈ بھرنا پڑا اور ہم جرمنی چلے گئے۔ بھیا کی مدد سے ہی برلن میں چھوٹا سا فلیٹ مل گیا۔ یہاں بھی انور کے اخلاق سے متاثر ہو کر آس پاس کے جرمن اور غیر جرمن ان کے دوست بن گئے۔ ہمارے پڑوس میں مارگریٹ اور ایڈبرگ بھی تھے۔ ان کے ماں باپ بون میں تھے۔ شفقت و ممتا کے بیچ بڑی سی برلن کی دیوار حائل تھی۔ انہوں نے زندگی کے کئی ماہ و سال ہوسٹلوں میں گذارے تھے۔ انہی پڑوسیوں میں فریڈرک اور ولیم بھی تھے۔ فریڈرک نے زندگی بھر کنوارے رہنے کی ٹھان رکھی تھی کیونکہ اس کی محبوبہ دیوار کے اس طرف تھی۔ اسے دورے پڑتے تو برلن وال سے سر ٹکرایا کرتا۔ دوست احباب بڑی مشکل سے اسے قابو میں کرتے۔ ڈرگ ایڈکٹ (Drug Addict) ولیم کی حالت بہت خراب رہا کرتی۔ اس کی بیوی اور ایک بچہ اُس پار رہ گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ دیکھ کر مجھے ایسا لگتا کہ جرمنی کا ہر شخص دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔

تاجور کو میں ہر ہفتے خط لکھتی تھی۔ خط کیا وہ تو ہفتے بھر کی روداد ہوا کرتی۔ لیکن چار سال گذرتے گذرتے میرے اور تاجور کے بیچ خط و کتابت بتدریج کم ہوتے ہوتے بالکل ہی بند ہوگئی بیچ میں سندھ کے حالات دیوار بن کر حائل ہوگئے۔ اس بیچ میرے گھر والوں کے خطوط سے پتہ چلا کہ تاجور کی شادی ہو رہی ہے۔ ہم چاہ کر بھی نہیں جاسکے کیونکہ ہم نے دس سال کا بونڈ بھرا تھا۔ میں اور انور دل مسوس کر رہ گئے

پھر انور کے نام ان کے والدین کے خطوط آنا بھی بند ہو گئے۔ وہ بہت پریشان رہنے لگے۔ امّی ابّا کے خطوط سے پتہ چلا کہ پاکستان میں مہاجروں کی حالت بہت ہی خستہ ہے۔ سندھی، مہاجر، پٹھان آپس میں لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اخبارات میں پاکستان کے بدترین حالات کی خبریں شائع ہو رہی تھیں جنہیں پڑھ کر انور کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

اس بیچ جب ہمارے یہاں فیصل اور اس کے بعد فرخ کی پیدائش ہوئی تو انور کچھ حد تک زندگی کی راہ پر پھر سے گامزن ہوئے اور ان کے دوستوں نے بھی اسے سنبھالا، مسکراہٹ جو معدوم ہو چکی تھی، لوٹ آئی۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ بیحد اداس اور غمگین ہو جاتے۔ کبھی کبھی سب چھوڑ چھاڑ کر واپس لوٹنے کو تیار ہو جاتے۔ میں اور بھیا بہت مشکل سے انہیں مناتے۔ وطن سے دوری کا احساس ہر دم گھیرے رہتا۔ انہیں سرد و گرم حالات کے بیچ دس سال گذر گئے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جس کے انتظار میں جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ انور کی خوشی دیکھتے ہی بنتی تھی۔ میں بھی کم خوش نہیں تھی۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سے بچھڑے عرصہ گذر گیا تھا مگر آدھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انور کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہیں نظر نہ لگ جائے اور اماں کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کیا اور نذر اتار دی۔

کراچی ایرپورٹ پر میرے گھر والے موجود تھے مگر انور کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ان کے دلی جذبات کا خیال کر کے رنج ہوا کیونکہ اُمید کے مطابق ان کے ماموں جان نہیں آئے تھے، جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ انور کی آنکھیں بھر آئیں۔ ابّا نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا تو وہ سسک پڑے۔

ہم گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ انور کے ماموں جان ہمارا پڑوس چھوڑ کر اپنے گاؤں لوٹ گئے تھے۔ وہ ہی کیا آس پاس کی تمام سندھی فیملیز اپنے اپنے آبائی وطن لوٹ گئی تھیں۔ اس بیچ ہوئے خونی فسادات کے حالات جان کر انور کا بُرا حال تھا وہ شام ہی کو اپنے گاؤں جانے کے لئے بضد تھے۔ سکھر کے حالات بہت خراب تھے۔ ابّو امّی نے بہت مشکل سے انہیں روکا مگر ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ابّا نے انہیں نیند کی دوا دی تو وہ کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سو گئے۔

کھانا کھا کر دونوں بچے بھی سو گئے تھے مگر میری آنکھوں سے تو نیند کوسوں دور تھی۔ وسوسوں اور

اندیشوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں اماں کے کمرے میں آگئی "یہ سب کیا ہو گیا اماں؟" میں ڈبڈبائی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "وہی جو نہیں ہونا چاہئے بیٹی، ایک ہی کمرے میں کئی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں حالات اب وہ نہیں رہے جو آج سے دس سال پہلے تھے۔ اپنے ہی بھائیوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے تمہارے ابا کو اورنگی ٹاؤن چھوڑنا پڑا۔ وہاں اپنا مکان چھوڑ کر یہاں کرائے کے مکان میں پڑے ہیں۔ سچ تو یہ ہے بیٹی کہ جو ایک بار اپنا گھر چھوڑ دیتے ہیں پھر ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ۴۷ء میں تمہارے نانا نے مذہب کے نام پر اپنے بھائی اور بہن کو گنوایا تھا۔ ۷۱ء میں تمہارے ابا زبان کے نام پر اپنا خاندان داؤ پر لگا آئے ... ہم بے جڑ کے پودے ہیں بیٹا۔ ان کی آواز بھر آگئی۔

"تاجور سے آپ آخری بار کب ملیں؟" "تمہارے جانے کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی آخری بار وہ پانچ سال پہلے اپنی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی۔ مگر جانتی ہو، اس نے کیا کہا، وہ زار و قطار رو رہی تھی اور بولی تھی" "میری شادی پر کوئی نہ آئے تو اچھا ہے۔ 'اُف' میرے منہ سے نکلا اور میری آنکھوں سے آنسو آپ ہی آپ بہتے چلے گئے۔ میں اماں کے سینے میں منہ چھپائے دیر تک روتی رہی۔ نمکین سیلاب تھما تو میں نے پوچھا۔ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟" "وہ کہتے ہیں ہم مہاجر ہیں اور ان کے وطن میں زبردستی گھس آئے ہیں۔" اماں بولیں۔ "وطن" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کیا مہاجر ہونے کے علاوہ ہماری کوئی شناخت باقی نہیں۔ وہ وقت بھول گئے جب ماؤں اور بہنوں نے اپنے لہو سے سرخ آنچل کو اس دھرتی پر بچھایا تھا تب ہم نے یہاں قدم رکھا تھا دل چھلنی تھے اور پاؤں زخمی۔ میں غم و غصے سے بھری بیٹھی تھی۔

"بیٹا اب تو غیر زبان بولنے والے بھی ان کے لئے ذات ممنوع ہیں۔ ان کے لڑکے آنے جانے والے کا شناختی کارڈ چیک کرتے ہیں اور اب تو اردو صرف مہاجروں کی زبان ہی رہ گئی ہے۔ ان کے علاقوں میں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" اماں میرا سر سہلاتے ہوئے بولیں۔

اگلے دن انور سکھر جانے کے لئے بضد تھے اور اب تو ان کا انداز جارحانہ ہو چلا تھا میں نے بچوں کا واسطہ دے کر انہیں روکا۔ وطن کی مٹی کی پکار پر غیر ملک سے جو خوبصورت خواب سجائے لوٹے تھے ایک ایک کر کے پاش پاش ہو چلے تھے۔ میں چُور چُور ہوئے ان خوابوں کو سمیٹنے میں خود بکھرتی جا رہی

تھی۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا تھا۔

"انور آپ بجائے اپنے والدین کے چودھری انکل سے رابطہ قائم کیجئے ان کا بیٹا اجے آپ کا دوست بھی تو ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ لوگ تو مہاجر نہیں اور اس الزام سے بھی بری ہیں کہ ان کے وطن میں زبردستی گھس آئے ہیں۔ وہ ہماری مدد ضرور کریں گے۔" میری تجویز پر انور نے قدرے سکون کی سانس لی اور بولے "حیرت ہے مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا۔ ہاں میرے پاس ان کا فون نمبر ہو گا۔"

فون بہت مشکل سے لگا۔ چودھری انکل فون پر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ ان کے ماں باپ بہت کسمپرسی کی حالت میں ہیں اور بیٹے کی شادی مہاجروں میں کرنے کی سزائیں بھگت رہے ہیں کہ ان کی جائیداد ضبط کر کے انہیں برادری سے باہر کر دیا گیا ہے۔ تاجور اپنے چچازاد بھائی سے بیاہی ہے۔ اسے کبھی کبھی ماں باپ سے ملنے کی اجازت مل جاتی ہے۔

اتنا سن کر انور تو بے ہوش ہو گئے۔ ہم سب بہت پریشان تھے۔ کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب تو سکھر جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔

اماں ابا کے منع کرنے کے باوجود میں بھی انور کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ بچوں کو میں نے ان کے نانا نانی کے پاس ہی چھوڑ دیا۔ ہم یوں روانہ ہوئے۔ جیسے جہاد پر نکلے ہوں۔ ہم دونوں نے خالص سندھی لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے تو سندھی زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ انور نے مجھے کہیں بھی بولنے کا موقع نہ دیا۔ وہ پہلے کلین شیو تھے۔ اب داڑھی رکھ لی تھی، بالوں کا اسٹائل بھی بدل لیا تھا۔ پہلی نظر میں انہیں پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے سندھی چادر اوڑھ رکھی تھی اور گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔

لمبے سفر کے بعد ہم چودھری انکل کے گھر پہنچے تو پروگرام کے مطابق تاجور اور اس کے والدین وہاں موجود تھے۔ ایسی ملاقات کا رقت آمیز منظر چودھری انکل اور ان کے گھر والوں کو بھی رلا رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں دلاسہ دیا، ہمت بندھائی تو ہم کچھ بول سکنے کے قابل ہوئے۔

اس دن ہم انکل کے گھر رکے اور تاجور اپنے والدین کے ساتھ صبح آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ میں روکتی ہی رہی مگر انور اندھیرا ہوتے ہی اپنے آبائی گھر چلے گئے وہاں کے در و دیوار انہیں

پکار رہے تھے ۔ میں ساری رات خدا کے حضور سجدہ ریز رہی ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ اگلے دن وہ علی الصباح ہی چلے آئے ۔ آنکھیں گواہ تھیں کہ رات بھر جاگے ہیں ۔ چودھری انکل نے ہمارے آرام کا پورا خیال رکھا ۔ اجے نے انور کو بہت سنبھالا تھا ۔ اس کی بیوی دیپیکا بھی بہت اچھی تھی ۔ ہم سب اکٹھے ناشتے کے لئے بیٹھے تاجور ڈھیر سارا ناشتہ بنالائی تھی ۔

ناشتے کے دوران ہی انور نے ماں باپ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو ان کے والد نے کہا ۔ " بیٹا جو ہونا تھا ہو گیا ۔ اب اس مٹی کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے ' اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے چلے جانے کا سب سے برا اثر دھی تاجور پر پڑے گا کیا تو بہن کو برباد ہوتا دیکھ سکے گا ؟ " ان کی آواز بھر آگئی ۔ موضوع دکھ دینے والا تھا ۔ ہم نے پلیٹوں میں لیا ہوا ناشتہ بڑی مشکل سے ختم کیا ۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی ۔ میں اور تاجور ٹیرس پر چلے آئے ۔ گلے لگ کر خوب روئے ۔ اسے اپنے بھتیجوں سے نہ ملنے کا قلق تھا ۔ پھر پرانی باتیں یاد آنے لگیں ۔ آنسوؤں کے بیچ ہم نے کالج کے ان اچھے دنوں کو یاد کیا جب تفریق کی دیوار نہیں تھی ۔ ہم نے اپنی شرارتیں یاد کیں تو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ پھر تاجور نے باتوں کا رخ موڑا اور بولی ، تم نے اپنے خطوط میں کسی اینا اور اس کے دو بھائیوں کے بارے میں لکھا تھا ان کی کہانی تو ادھوری ہی رہ گئی تھی ' وہ سناؤ ۔ میں تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی :

" میں نے تمہیں خط میں لکھا تھا کہ برلن میں لگنے والے سالانہ میلے میں میری ملاقات اینا سے ہوئی تھی ۔ اس کے دو بھائی تھے ۔ ماں باپ کی ناگہانی موت کے بعد اینا نے ہی اپنے چھوٹے بھائیوں کو پالا تھا ۔ رون اور بالٹکے جڑواں ہونے کے باوجود مزاج میں تضاد رکھتے تھے ۔ دونوں بے انتہا لڑتے تھے ۔ جائیداد کو لے کر دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا ۔ اور نوبت قتل و خون تک جا پہنچی ۔ اینا کچھ نہ کر سکی ۔ بون میں ان کی ایک آرمس کی فیکٹری تھی برلن میں بڑی کوٹھی ۔ اینا نے برابر کا بٹوارہ کرنا چاہا مگر اس کی کسی نے نہیں سنی ۔ رون نے کوٹھی کا ایک حصہ خطرناک مجرم موڈی کو بیچ دیا اور خود روپے لیکر فرار ہو گیا ۔ بون پہنچ کر وہاں کی فیکٹری پر بھی قابض ہو گیا ۔ بالٹکے نے بھائی کو جان سے مارنے کا تہیہ کر لیا مگر اتفاق دیکھو کہ اسی زمانے میں جرمنی کے سینے پر دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ رون ادھر اور بالٹکے بہن کے ساتھ ادھر رہ گیا ۔ انتقام کی آگ ادھوری رہ گئی ۔ قانون کی مدد سے اینا موڈی

کوکوٹھی سے نکال پائی ۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے اب تو دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ یہ کہانی مجھے اینا نے سنائی تھی جب میں اس کے بھائی کے پوتے کی سالگرہ میں ان کے یہاں گئی تھی ۔ اینا کا شوہر موذی روگ کا شکار ہو کر سینی ٹوریم میں پڑا تھا ۔ اینا چرچ اور سینی ٹوریم کا چکر لگاتے لگاتے ضعیف ہو گئی ۔

تاجور سنتے سنتے چونکی " مگر انجام کیا ہوا ؟ وہ انتقام کی آگ ؟" " ہاں انجام تو میرے سامنے ہوا جب دیوار ٹوٹی ۔"

" تو کیا بھائی نے بھائی کو مار ڈالا ؟" وہ تشویش سے بولی ۔

" چلو بچیو چائے پر انتظار ہو رہا ہے ۔" آنٹی ہمیں بلانے آئی تھیں ، ہم اُٹھ کھڑے ہوئے ' چلو ' باقی باتیں وہیں پر ہوں گی ۔"

یہاں سب ہمارے منتظر تھے " بتاؤ نا دیوار ٹوٹی تو کیا ہوا ؟" تاجور بہت بے چین تھی ۔ اسکی بات پر سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے ۔ " برلن وال ٹوٹی تو دونوں بھائی گلے مل کر اتنا روئے کہ اُن کے آنسو پرانی دشمنی بہا لے گئے ۔" میں خاموش ہو گئی ۔ چودھری انکل سے رہا نہ گیا وہ رقت آمیز لہجے میں بولے ۔" لیکن بیٹا ہم سب کے بیچ جو دیواریں حائل ہیں وہ کب ٹوٹیں گی ؟"

ہم چونک پڑے ، سوال پر نہیں بلکہ دروازے پر ہونے والی لگاتار دستک پر ۔ باہر بہت سے لوگ تھے ۔

(۱۹۹۴ء)

گہن

دودھ والے کی آواز پر بیلا باہر آئی تو اس نے دیکھا۔ وہ آج بھی وہیں بیٹھا ہے اپنی مخصوص جگہ پر اور حسب عادت اس کی طرف رُخ کئے مُسکرا بھی رہا ہے۔ یہ سلسلہ سردیوں کے آغاز پر شروع ہوا تھا۔ وہ جب بیاہ کر گاؤں سے شہر آئی تھی تو گرمیاں اختتام پر تھیں۔ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ اور اس کے ورانڈے سے سورج کی کرنیں گذر کر مارکیٹ کی دوسری طرف جاتی تھیں۔ جہاں کچھ مکانات تھے۔ 'وہ' بھی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ نمودار ہوتا اور بیچ میں ناشتہ، کھانا اور چائے کے وقفے کے علاوہ سارا وقت اس ورانڈے میں گزارتا تھا۔

بیلا کا شوہر کاظم صبح کا گیا رات کو گھر آتا اور تھکن کے باعث جلد ہی سوجاتا۔ بیلا کئی بار کہہ چکی تھی "مجھے شہر گھمادیں کم ازکم ایک عدد فلم ہی دکھادیں" مگر اتوار کی چھٹی میں بھی کاظم کو دیر تک سونا اور اچھے پکوان کھانا پسند تھا۔ وہ ہمیشہ اگلے اتوار پر ٹال دیا کرتا۔ اور بیلا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خالہ سے شکایت کرنے کی دھمکی دے جو اس کی ساس بھی تھیں۔ بیلا سارا دن بولائی بولائی سی پھرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح وقت کاٹے۔ خالی اوقات میں وہ کھڑکی سے لگی سڑک پر آتے جاتے لوگوں اور گاڑیوں کو تکا کرتی۔

انہیں دنوں اسے محسوس ہوا کہ سامنے والا شخص روز وہیں بیٹھتا ہے۔ اور اسے ہی تکتا رہتا ہے۔ طرّہ یہ کہ وہ مسکراتا بھی ہے۔ اسے بہت غصّہ آیا۔ "اب کیا میں اس آدمی کی وجہ سے اس اکلوتی کھڑکی تک آنا بھی چھوڑ دوں" وہ بہت جھنجھلائی۔ اس سلسلے کو کافی دن بیت گئے۔ بیلا، دودھ سبزی یا اور کچھ لینے دن میں دو چار دفعہ دروازے تک آتی۔ اور گھر کے کام نپٹا کر کھڑکی سے لگ جاتی۔ وہ، بدستور وہیں بیٹھا ہوا ملتا۔

بیلا نئی نئی شہر آئی تھی۔ شہر میں ملنے جلنے والوں نے گاہے گاہے اسے یہ احساس دلایا کہ وہ بہت حسین ہے اور اس کے لحاظ سے اس کا شوہر ...... پڑوسن نے اس معاملے میں اہم رول ادا کیا۔

اس دن بھی پڑوسیوں کے یہاں سالگرہ میں لوگ مڑ مڑ کر اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ کئی ایک کی تو واضح سرگوشیاں بھی اس نے سنیں۔ "ہیرے کو قدر دان نہیں ملا"۔ "بیلے کا پھول ساتھ میں بھنورا"۔ بیلا نے شوہر کی طرف دیکھا۔ "بس رنگ ہی تو کالا ہے، پر مرد کا کیا؟ صورت پہ کون جاتا ہے۔ اچھا کھانا اچھا پہننا اور کیا چاہیے۔" اس نے خود کو سمجھایا۔

آج جب وہ جھروکے میں آئی تو اسے محسوس ہوا کہ کبھی کبھی وہ یوں ہی چلی آتی ہے۔ بغیر کسی کام کے کھڑکی میں دروازے پر۔ تو کیا وہ شخص غیر ارادی طور پر اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کھڑکی کے پٹ زور سے بند کئے۔ جیسے اپنے دل کے کواڑوں کو بند کر رہی ہو۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔

اب وہ اکثر کام کے دوران بھی کھڑکی سے لگی کھڑی رہتی۔ سالن جلنے کی بُو اس کی محویت کے حصار کو توڑتی تو اسے احساس ہوتا اور سر جھٹک کر پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ وہ باورچی خانہ میں ناشتہ تیار کر رہی تھی کاظم آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے بیلا سے کہا "شام کو پانچ بجے تیار رہنا میں فلم کے ٹکٹ لیتا آؤں گا۔" وہ خوش ہو گئی۔ لیکن پھر خیال آیا تو بولی۔ "ہونہہ! یہ وعدہ تو آپ پہلے بھی کر چکے ہیں پر نبھایا کبھی؟" "ارے آج ضرور چلیں گے۔ تم اپنی آسمانی ساری ضرور پہننا، تم اس میں بہت حسین لگتی ہو۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

بیلا نے بہت سے کپڑے دُھلنے کے لیے ڈال رکھے تھے۔ اس نے جلدی سے انہیں دھو ڈالا۔ اور گھر کے باقی کام بھی نپٹا لئے۔ آج اسے کھڑکی تک جانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ وہ خوبصورت

شام کے تصور میں اپنے کام نپٹاتی رہی ۔ دودھ اور سبزی لے کر آج وہ دروازے پر بھی نہیں ٹھہری فوراً اندر چلی گئی ۔

شام سے پہلے ہی بیلا بہت اہتمام سے تیار ہوئی ۔ گورے رنگ اور تیکھے نقوش پر آسمانی ساری غضب ڈھا رہی تھی ۔ کاظم نے اسے سر میں تیل ڈالنے سے منع کیا تھا ۔ اور اس کی تاکید تھی کہ وہ صرف نہلانے سے پہلے انہیں تیل میں ڈبویا کرے ۔ آج بیلا نے اپنے لمبے بالوں کی ڈھیلی چوٹی کر رکھی تھی ۔ وہ آئینہ دیکھ کر خود سے شرما رہی تھی ۔ پانچ بجنے کو تھے ۔ اس نے آخری بار اپنے آپ پر طائرانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر کاظم کی راہ تکنے لگی ۔

اور اس کے سارے ارمانوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب گھڑی نے ساڑھے چھ بجائے ۔ کاظم کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ بیلا نے اپنا غصہ یوں اُتارا کہ مزیدار پکے ہوئے سالن میں تیز مرچ اور نمک جھونک دیا ۔ اور جلی ہوئی روٹیوں کو نہایت اہتمام سے ڈھک کر رکھ دیا ۔ سر میں پاؤ بھر تیل انڈیل کر وہ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے آخر سو گئی ۔

کاظم آفس سے لوٹا تو گھر کا دروازہ کھُلا ہوا ملا ۔ کمرے میں آیا تو بیلا پر نظر پڑی اور اسے اپنا وعدہ یاد آیا ۔ بیلا نے آسمانی ساری پہن رکھی تھی ۔ جس پر اب جگہ جگہ تیل کے داغ لگ چکے تھے ۔ مگر وہ بے خبر سو رہی تھی ۔ کاظم نے چُپ چاپ کھانا کھا کر سو جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی ۔

وقت گزرتا رہا لیکن بیلا کے شب و روز تھے کہ گذرتے ہی نہ تھے ۔ بیلا کی طبیعت بہت بیزار ہو چکی تھی ۔ گھر سے ، گھر والے سے کسی کام میں اس کا جی ہی نہ لگتا ۔ کاظم پاس ہوتا تو خواہ مخواہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور بند آنکھوں میں 'وہ' چھم سے جگنو کی طرح آ دھمکتا ۔ گھر کے تئیں اس کی لاپروائی بڑھتی جا رہی تھی ۔ ایک دن تو کاظم نے اسے ٹوک ہی دیا ۔ "کیا بات ہے بیلا تمہاری آنکھوں کی چمک ماند کیوں پڑ گئی ہے ۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ کئے گھومتی رہتی ہو ۔ کھانا بھی آج کل نہایت بدمزہ ہوتا ہے ۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا بھئی !" اس نے سخت الفاظ میں بیلا کو تنبیہہ کی ۔ بیلا چونکی "کیا چوری پکڑی گئی ؟" پھر اُس نے خود کو سمجھایا "ہونہہ انہیں کیا پتہ سارا دن آفس میں گزار کر رات کو گھر آتے ہیں ۔ آتے ہی کھانا اور لمبی تان کر سو جانا ۔" ایک روز جب بیلا کھڑکی پر آئی تو 'وہ' پہلے ہی سے اپنی مخصوص جگہ پر

بیٹھا تھا۔ آج وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بیلا کے دل و دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔ دل کی دنیا میں ہلچل مچی تھی۔ "خدایا! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ سامنے والا شخص واقعی اتنا پُرکشش ہے یا صرف مجھے ایسا لگتا ہے۔" وہ اپنے آپ سے بولی۔ پھر نہ جانے کن جذبوں سے مغلوب ہو کر ایک روز اسے گھر آنے کا اشارہ کیا، وہ تو نہ آیا، ہاں پرلی طرف سے بنئے نے اپنے چھوٹے نوکر کو دوڑایا۔ "جا دیکھ بی بی کو کوئی سامان کا ضرورت ہے، آندھی ایسن جائیو طوپھان کی طرح آئیو۔" بنئے کے نوکر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بیلا دروازہ بند کر کے اندر بھاگ گئی۔ "کھالی پیلی دوڑا دھین۔" نوکر جھنجھلا کر واپس چلا گیا۔

اگلے دن بھی بیلا نے اسے بلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ آیا۔ وہ بہت غصّے میں تھی۔ "آنکھوں آنکھوں میں بڑی محبت جتاتا ہے۔ ارے اس سے اچھا موقع اور کیا ملتا میں نے خود اسے بلایا تھا۔" وہ یہ باتیں سوچ سوچ کر کڑوے گھونٹ بھر رہی تھی۔ غیرارادی طور پر وہ گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے پھر اسے بلایا۔ مگر وہ اِدھر آنے کے بجائے مارکیٹ کی دوسری طرف چلا گیا۔ بیلا رونے رونے کو تھی۔ "بے وفا، بے مروت۔ آگ لگا کر مکر گیا۔"

اگلے دن اتوار تھا چھٹی تھی کاظم گھر پر تھا۔ بیلا دودھ لینے باہر آئی تو وہ حسب معمول کرسی پر بیٹھا اس کی طرف رخ کئے مسکرا رہا تھا۔ بیلا کی جان ہی تو جل گئی۔ "آگ لگے تیری مسکراہٹ کو۔ ٹھہر ابھی کاظم سے کہہ کر تیری خبر لیتی ہوں۔ خوب نمک مرچ لگا کر بتاؤں گی۔ یہ بھی کہہ دوں گی کہ اشارے کرتا ہے اور خط بھی ڈالتا ہے۔" وہ کچن میں دودھ رکھ کر کاظم کو لے کر دروازے پر آئی اور بولی "وہ ..... سامنے جو آدمی بیٹھا ہے نا ..... نیلے سوئٹر والا!" ابھی اس کی بات شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ کاظم دروازہ کھول کر باہر جانے لگا اور بولا ..... "وہ ..... ٹھہر دمیں اس سے مل کر آتا ہوں مصروفیت میں وقت ہی نہیں ملتا۔ میرا بڑا اچھا دوست ہے بھئی ....." کاظم چلا گیا۔

بیلا ٹھنڈ کے باوجود پسینے سے نہا گئی۔ "ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟" شوہر سے منافقت کے خیال نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا۔ وہ کمرے کی طرف بھاگ آئی۔ بدنامی کے خوف نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا۔ شوہر کا غصّے سے بھرا چہرہ اس کی نظروں میں گردش کرنے لگا۔ "گھر میں کسی قسم کا زہر بھی نہیں؟ مکان بھی کئی منزلہ نہیں کہ کود کر جان دے دوں اور جل کر مرنا تو بڑا اذیت ناک ہے۔" وہ اسی

شش و پنج میں تھی کہ کاظم آگیا۔

"آج خیر نہیں" اس نے بے بسی سے سوچا۔

بیلا تمہیں پتہ ہے یہ جو سامنے مارکیٹ ہے نا یہ تیمور کی ہے' اور پچھلی طرف کے مکانات بھی۔ بہت بڑی جائداد کا مالک ہے۔ بس ایک ماں ہے اور وہ۔ ارے اسوقت کا بادشاہ ہے بادشاہ" کاظم اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا۔ "مگر ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تیمور لنگ تھا یہ یہ تیمور اندھا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر غسل خانے میں چلا گیا اور بیلا بستر پر ڈھے سی گئی۔

(۱۹۹۱ء)

ملیچھ

"سیبو ـــــ ارے سیبو کہاں گیا رے ؟" روپنی گوبر سے لتھڑی ٹوکری آنگن کے بیچوں بیچ رکھ کر بیٹے کو پکارنے لگی ۔ مالکن نے ناگواری سے اسے گھورا اور بولیں "کاہے کو لے آتی ہے اس کو... اور اگر لاتی ہی ہے تو بیٹی کو بھی ساتھ لایا کر، کولہے پر ٹانگے پھرے گی... پٹو سا تو ہے رینگ گیا ہوگا یہیں کہیں ۔" روپنی کو مالکن کی بات بُری لگی ۔ پلو سا بچہ دونوں پاؤں سے لاچار اور کمزور تھا مگر تھا تو اس کے جگر کا ٹکڑا نا ۔ اور پھر بیٹا دھن تھا ۔ "ابھی نہ آئی تھی ناچ منڈلی اسی کے پیچھے پیچھے گیا ہوگا ۔" بھات پساتی بھولیا باورچن بولی ۔ روپنی بیٹے کو ڈھونڈنے ڈھول کی آواز کی سمت چلی گئی ۔

"کس کا بیاہ ہے ری بھولیا ؟ مالکن نے پوچھا ۔" پورب ٹولے کے مکھ لال کی بیٹی کا گونا ہے ۔" بھولیا نے چولہا پھونکتے پھونکتے سر اُٹھا کر کہا ۔" ہائیں کون ؟ اس چمپیا کا ؟ ارے ماتھا کیا پھر گیا ہے مکھ لال کا، توری کی بیل سی چمپیا کا گونا کر رہا ہے ارے کچا پودا ابھی ہی پھل دے گا ۔" مالکن کچھ ناراضگی سے بولیں ۔

"نا مالکن وہ ٹھیک ہی کر رہا ہے ہمرے چھاتی پر جو پانچ کٹو پہاڑ دھری ہیں وہ ہم ہی جانے ہیں ۔" روپنی بولی جو جانے کب اُسارے پر آ بیٹھی تھی اور یہ کہتے ہوئے شفاف آنسو اس کے سیاہ گالوں پر ڈھلک آئے ۔

"ارے کیوں گھبراتی ہے وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا، یہ بتا سیبو ملا ؟" ان کی بات بھی نہ ختم ہوئی

تھی کہ روپی کی سب سے چھوٹی بیٹی تاڑ کی سوکھی چھال گھسیٹتی آپہنچی۔ جس کے چوڑے سرے پر سیبو بیٹھا تھا۔ روپی نے بیٹی کی پیٹھ پر دھموکا لگایا اور بیٹے کی ناک صاف کرتی ہوئی بولی۔ "یہ ہی حرمجادی لے گئی تھی۔" "اچھا، اچھا اب جا کام کر۔ تو ٹھہر پرمیلا! مالکن نے کہا۔ انہوں نے کھجور کے پتے سے بنے بیتوے میں جو ہمہ وقت سیبو کے ہاتھ میں رہتا تھا دو مٹھی پھڑی ڈال کر اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہیں بیٹھا رہ خبردار جو اِدھر اُدھر گیا تو . . . ." پھر انہوں نے پرمیلا کو اپنے پوتوں کے پھلئے دھولے کو دیئے اور بولیں کہ وہ انہیں اچھے سے دھوکر پسار دے۔ پھر خود لہسن بھیگے تیل کی کٹوری اور کھلوٹی لئے پوتے کی مالش کرنے چل دیں۔

اب موسم بدل رہا تھا خنکی بڑھ گئی تھی۔ مالکن نے چھوٹی بہو کو تاکید کی تھی کہ وہ بچے کو لیکر دھوپ میں بیٹھی رہا کرے۔ گرچہ گاؤں کے رواج کے مطابق پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے اور بہو بچہ لے کر سال ڈیڑھ سال بعد سسرال جاتی ہے۔ مگر جب چھوٹی بہو کے میکے والے اُسے لینے آئے تو انہوں نے نا کردی اور جواز یہ دیا کہ لے جانا تھا تو دو چار مہینے پہلے لے جاتے یہ کیا کہ بچہ ہونے کو دو چار دن رہ گئے ہیں اور چلے آئے منہ اُٹھائے۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنی بہو اور ہونے والے بچے کو اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ بڑے بیٹے نے شہر میں پڑھائی کے دوران ہی شادی کر لی تھی اور شہر کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ گاؤں آنے کا نام نہ لیتا، اب تو تین بچے تھے اس کے۔ ماں کا دل کچوٹتا رہتا سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے یاد کیا کرتی تھیں۔ بیٹیاں چونکہ اپنی گرہستی میں مگن تھیں اس لئے کم ہی آتی تھیں۔ حاجی صاحب بیوی کی حالت سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے بہو کے مائیکے والوں کو سمجھا بجھا کر لوٹا دیا تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ حاجی صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ مالکن بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ "کل بھولا آیا ہے شہر سے، 'بہو بیمار ہے'، وہ بتا رہا تھا۔" وہ نوالہ منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے بولے۔ "ہے تو ہے بیمار ہمیں کیا؟ مالکن قدرے غصے سے بولیں۔ "نا . . . نا ایسا نہیں کہتے وہ تمہارے پوتے پوتیوں کی ماں ہے۔" حاجی صاحب نے بہو کے حق میں کہا۔ "ہائے ہائے ان شہر والوں کی تو بات ہی نہ کریں۔ ہمارے بیٹے کو ہم سے چھڑا دیا۔" مالکن کی آنکھیں بھر آئیں۔ "سارا قصور بہو کا تو نہیں۔" انہوں نے سمجھایا۔ "رہنے بھی دیجئے ان شہریوں کے چریا چرتر آپ کیا جانیں؟" وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں۔ "تو تم جانو ہو؟

حاجی صاحب نے مذاقاً کہا تو وہ بولیں ۔ "تین سال ہونے کو آئے۔ اب تو عید بقرعید پر بھی گاؤں نہیں آتے۔"
وہ اُداس ہوگئیں۔ "تو تم ہی ہو آؤ نا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "لو بھئی ہم کیوں پاک صاف دھرتی کو
چھوڑ کر شہر کی گندگی میں جائیں۔" وہ پاؤں موڑ کر کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "اری نیک بخت تو بہت
بھولی ہے۔" گاؤں کب محفوظ ہیں تمہیں کیا پتہ شہر کی گندی سیاست کے جراثیم اب یہاں بھی پنپنے لگے
ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "کچھ بھی ہو کم از کم مذہب کے نام پر دنگے تو نہیں ہوتے نا
یہاں۔" وہ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے بولیں۔ "آخر کب تک محفوظ رہ سکیں گے یہ گاؤں۔ ہوائیں بڑی مسموم
ہیں۔" انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے؟ بڑے پریشان لگ رہے ہیں۔" وہ فکرمند ہوگئیں۔
"داؤد کی ماں! ملک کے حالات اچھے نہیں، ارے اخبار یا ریڈیو سے تمہارا کوئی واسطہ ہو۔ تب نہ پتہ چلے کہ دنیا
میں کیا ہو رہا ہے۔" وہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولے۔ "نا بھئی نا، اگر ریڈیو سن کر اور اخبار پڑھ کر راتوں کی نیند
اور دن کا چین حرام ہو جائے تو پھر جاہل ہی رہنا بہتر۔" حاجی صاحب ان کی سنجیدگی دیکھ کر ہنسنے لگے۔

اگلے روز دن چڑھے تک روپنی کا پتہ نہ پاکر مالکن کو فکر ہوئی۔ "اری بھولیا یہ روپنی کاہے نہیں
آئی؟ دوار بیٹھک جھاڑنے بہارنے کو باقی ہے، گوبر گوہال میں دھرا ہے، آج سب کچھ گندا سندا رہے گا
کیا؟" انہوں نے باورچن سے پوچھا۔ "پتوا بیچنے گوپال کی ماں آئی تھی نا وہ بتائی کہ سیبو کے کولہے میں شیشے
کا ٹکڑا گڑ گیا ہے۔ سارا خاندان اسی میں لگا ہے۔" بھولیا نے بتایا۔ "آئے ہائے مفلسی میں آٹا گیلا، اس
کمبخت سیبو کے بچے کو چین بھی تو نہیں، گھسٹتا پھرتا ہے۔ چاروں طرف، اب یہ نئی مصیبت مول لے لی،
غریب ماں کیا کیا کرے ..... جانے کیا ہوگا اس بے پیندے کے لوٹے کا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی نل کی
طرف چلی گئیں۔

یوں تو روپنی کئی بار بول چکی تھی کہ اب کے کارتک ماہ میں وہ سیبو کے لئے پہیئے والی کرسی ضرور
لے لیگی مگر کئی کارتک گذر گئے وہ ناکام رہی۔ دونوں پاؤں سے معذور اس کا چھ سال کا بیٹا سیبو جب
زمین پر گھسٹتے ہوئے زخمی ہو جاتا تو وہ رو رو پڑتی تھی۔ وہ اپنی قسمت کو کوستی رہتی۔ دراصل جب اس کے
یہاں پانچویں لڑکی کا جنم ہوا تو اس کے پتی سکھدیو کا جی کھٹا ہو گیا۔ ہر دم جھنجھلایا رہتا۔ کام دھام بھی چھوڑ
بیٹھا تھا۔ بچیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار روپنی کو بھی دُھن کر رکھ دیتا۔ بالآخر چھوٹکی کا سال پورا ہوتے ہی

سیبو کو روپنی کے شکم میں ہی چھوڑ کر جانے کہاں بھاگ گیا۔ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ جب سیبو کا جسم ہوا تو ٹانگوں کی جگہ گوشت کے ننھے ننھے لوتھڑے تھے۔ پھر بھی روپنی بیٹا دھن پاکر پھولی نہ سمائی تھی۔ اس کے خیال میں دھن لولا ہو یا لنگڑا ہوتا تو دھن ہی ہے نا! اُس نے اپنی لڑکیوں کو بانس کی ٹوکریاں اور سُوپ بنانے کے لئے گھر بیٹھا دیا اور خود حاجی صاحب کا گوہال سنبھال لیا۔ حالانکہ سکھدیوا چندر موہن بابو کے یہاں کام کرتا تھا مگر ان کے یہاں تو پینے کے لئے پانی بھی ہریجن ٹولہ سے لانا پڑتا تھا۔ اور تو اور ڈیوڑھی لانگھنے تک کی اجازت نہ تھی اسے۔ بابوجی تو ایک بانس دور کھڑے ہوکر حکم سنایا کرتے تھے۔ گوہال یا سامنے کی باڑی کے علاوہ اسے اِدھر اُدھر جانے کی ممانعت تھی۔ کبھی کبھی تو سارا دن بھوکے پیاسے رہ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ روپنی اس طرح کی پابندیوں سے اوب چکی تھی اور اس کا اکلوتا جگر کا ٹکڑا بھلا ایک جگہ بیٹھنے والا کب تھا۔

اگلے دن روپنی آئی تو مالکن کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ حاجی صاحب سے ایک تعویذ لے کر دیں۔ پہلے بھی وہ کئی بار بول چکی تھی کہ اگر حاجی صاحب ایک تعویذ دے دیتے تو سیبو ضرر ٹھیک ہوجاتا۔ آج بھی اس نے بڑی لجاجت سے اپنی بات دہرائی تھی۔ "اری روپنی تیرے دماغ میں تو گوبر بھرا ہے، پچھلے برس تو نے 'چیتھڑیا پیر' کے نام پہ پیڑ میں لتا باندھ کر منت مانی، پھر اوجھا سے بھی جھڑوایا اور تو اور تو نے تو چوری کا پرشاد تک سیبو کو کھلا دیا۔ پر ہوا کچھ؟" مالکن نرم لہجے میں بولیں۔ "نا مالکن ایک ٹھو تابیج مل جاتا تو سیبو جرور ٹھیک ہوجاتا۔" اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ "اری پگلی سیبو کا علاج صرف نقلی ٹانگیں لگا کر ہی ہوسکتا ہے۔ یہ بات ہم ہی نہیں حاجی صاحب بھی کہہ رہے تھے۔ اگر نقلی ٹانگیں نہیں تو اس کے لئے پہیے والی کرسی بھی ٹھیک رہے گی۔" انھوں نے اسے سمجھایا۔ "اتنا روپیہ ہم کہاں سے لائیں گے مالکن؟" وہ رو پڑی۔ "اچھا، اچھا تو کوشش کر جو روپیہ گھٹے گا ہم دے دیں گے۔ اب جا کام کر۔" روپنی نے انھیں تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور ٹوکری اٹھا کر گوہال کی طرف چلی گئی۔

تنخواہ کے نام پر یوں تو اگہن اور بھادوں مہینوں میں روپنی کو اچھی خاصی آگی یا تیار فصلوں کا بیسواں حصہ مل جایا کرتا تھا۔ مگر پانچ جوان ہوتی لڑکیوں کی ماں، کمر سیدھی نہ کرپاتی تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ اگر سیبو ٹھیک رہتا تو سارے دلدر دور ہوجاتے۔ اس سال پٹ سن کی فصل اچھی ہوئی تھی۔ دام خوب اُونچے تھے۔ حاجی صاحب

کا چھوٹا لڑکا پکا مکان بنوا رہا تھا۔ اسی مناسبت سے روپی کو بھی فاضل آمدنی ہوئی تھی وہ بہت خوش تھی کہ اب وہ اپنے سبو کو پہیے والی کرسی ضرور دے گی۔ جو رقم گھٹی وہ مالکن نے دے دی۔ حاجی صاحب کی صلاح تھی کہ روپی سیدھی پورنیہ شہر چلی جائے وہاں صدر ہسپتال کے آس پاس پہیے والی کرسی ضرور مل جائے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ بیل گاڑی پٹ سن لے کر گلاب باغ جا رہی ہے۔ وہ شام تک کرسی لے کر وہیں واپس آجائے اور خالی گاڑی پر وہاں سے گھر لوٹ آئے۔

اگلی صبح دُھند میں ڈوبی ہوئی تھی، سورج ابھی پھوس کے گھروں کی لگر کی پرلی طرف تھا۔ چرواہے بھینسیں چرا کر گنگناتے ہوئے لوٹ رہے تھے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ تال دے رہی تھی۔ لگ بھگ سب کچھ معمول پر تھا۔ مگر روپی کو آج بہت جلدی تھی۔ اُسے گاؤں سے سات کوس دُور پورنیہ شہر جانا تھا۔

"روپی نہیں آئی؟" حاجی صاحب نے جلاون لے جاتی بھولیا سے پوچھا۔ "باؤ صاحب وہ تو آج نہیں آئے گی۔ شہر جو گئی ہے۔ قصبہ تک تو پیدل ہی جانا تھا سو بھورے بھور نکل گئی ہوگی۔ بھولیا نے تفصیل سے بتایا۔ اچانک دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچے آنگن میں گھستے چلے گئے "جبین دادی.... جبین دادی.... چاچا چاچی رکشہ پر آرہے ہیں۔" وہ سب چلّائے۔ بچے مالکن کو حاجی صاحب کی مناسبت سے جبین دادی کہا کرتے تھے گرچہ انہوں نے حج نہیں کیا تھا۔ ہنگامہ سن کر وہ گھبرا گئیں "ہائیں۔ کیا ہے کیا؟" ان کے منہ سے نکلا۔ حاجی صاحب اندر آئے اور بولے "ارے داؤد کی ماں سنبھال خود کو شہر سے بیٹا بہو اور بچے آرہے ہیں۔"

جھٹ پٹ اُسارے میں بستر لگ گیا۔ بدھنوں میں پانی بھر بھر کر کنارے رکھا گیا۔ بھولیا کو پراٹھوں اور مُرغ کا سالن بنانے کی ہدایتیں دے کر مالکن ڈیوڑھی میں آکھڑی ہوئیں۔ ہاتھوں کا چھجّہ آنکھوں پر رکھ کر سامنے نظر دوڑائی۔ ایک رکشے پر بہو اور بچے دوسرے پر بیٹا اور سامان تھا۔ ان کی دور سے بلائیں لیتی آنکھیں بھر آئیں۔

ان سب کے آتے ہی آس پاس کے بڑے اور بچوں سے آنگن بھر گیا۔ مالکن نے سب میں مٹھائی تقسیم کی وہ بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے تینوں بچوں کو سمیٹ رکھا تھا وہ چھوٹی چارپائی پر بیٹھی تھیں کبھی ایک کو گود میں لیتیں، کبھی دوسرے کو۔ بچے ان کے امڈتے پیار سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔ پر وہ چھوڑنے

کو تیار نہ تھیں۔ حاجی صاحب بھی قریب ہی مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ داؤد ہاتھ منھ دھو چکا تھا۔ "اچھا کیا بیٹا، جو گاؤں چلے آئے ہیں تو ہر وقت تم لوگوں کی فکر لگی رہتی تھی۔ حاجی صاحب بیٹے سے بولے۔ "شہر کی حالت تو بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے بابا۔ ۔ ۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ حاجی صاحب نے فکر مندی سے پوچھا "ابھی کی کیا خبر ہے بیٹا؟" "بابا فرقہ واریت کا پلیگ گھر گھر پھیل گیا ہے، ہر آدمی اپنے گھر کو قلعہ سمجھ کر اس میں محصور ہے اور اپنی اپنی کلٹی کا انتظار کر رہا ہے۔" داؤد اداسی سے بولا۔ "تم نے ٹھیک کیا جو گاؤں چلے آئے، یہ فرقہ پرستی کا پلیگ تو بستی کی بستی اُجاڑنے پر تُلا ہے۔" "شہر میں کرفیو لگنے کا امکان تھا سو ہم نے گاؤں چلے آنا ہی بہتر سمجھا۔ کم از کم گاؤں ابھی ان چنگاریوں سے محفوظ ہیں۔" داؤد نے کہا۔ اس کے چُپ ہوتے ہی حاجی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے "تم تو جانتے ہو بیٹا کچی مٹی میں بڑی جلدی شگاف پڑتے ہیں۔" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رُدینی ہانپتی کانپتی آ پہنچی۔ "بڑکا باؤ آئے ہیں ارے ہم کو بھی دیکھنے دو۔" اُس نے لڑکے بالوں کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اری رُدینی تو کب آئی؟ کرسی لائی؟" مالکن اسے دیکھتے ہی بولیں۔ "کہاں مالکن ہم تو آدھے سے زیادہ رستے جا چکے تھے۔ ایک ٹھو پنڈال لگا دیکھا تو جھانکنے چلے گئے۔ وہاں تو ہمرے ٹولہ کے بہت سے لوگ تھے۔ وہ ہی سب بولے کہ سہر بند ہے گاڑی جھکڑا سب بند۔ وہ کا بولا جاہے کرفو لگا ہے۔ پھر وہاں بھاسن ہووے لگا تو ہم بھی بیٹھ گئے۔" "او۔ تو۔ تو خالی ہاتھ ہی لوٹ آئی۔" مالکن نے بیچ میں اسے ٹوکا۔ "سنیے تو مالکن۔ ایک ٹھو آدمی بولا کہ 'دھرم کرم کا پالن بہت جروری ہے۔ پُن کے کام کے لئے چندہ دینا دھرم ہے اور ملیچھوں کا صفایا کرنا کرم، جو آدمی دو سو روپیہ سے اوپر چندہ دے گا اس کو ایک ٹھو وردان ملے گا۔" اتنا کہہ کر وہ چُپ ہو گئی۔ سب لوگ سانس روکے اس کی کتھا سن رہے تھے۔ پھر.... کئی آوازیں ابھریں۔ "آپ تو جانتی ہیں مالکن ہم سیبو کے لئے کتنے چنتت رہتے ہیں۔ سو ہم تین سو روپیہ چندہ دے کر ایک ٹھو وردان لے لئے۔" وہ چُپ ہو گئی۔ "ہائے ری قسمت تین سو روپیہ لُٹا کر کیا مانگ لیا تو نے۔" مالکن پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "ہم مانگے کہ اگلے جنم میں ہمرے سیبو کے ہاتھ میں گوبر کی ٹوکری کے بجائے آرتی کی تھالی ہو اور وہ امرناتھ کی یاترا کرے۔" آس پاس کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ وہ حاجی صاحب کی طرف گھوم کر پھر گویا ہوئی "دھرم تو ہم نبھا لیے پر کرم سمجھ میں نہ آیا 'یہ ملیچھ کے ہووے ہے حاجی صاحیب؟"

اجالوں کے نئے سفیر

وہ لا بے تابانہ ایک ایک چہرے کو بغور تک رہی تھی۔ شاید کوئی رُک کر اُس سے اُس کا حال پوچھے لیکن یہاں تو ہر شخص جلدی میں تھا۔ اور کسی نئے سفر کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ وہ پانی کا گیلن ہاتھ میں لئے حسرت سے ان پٹریوں کو تک رہی تھی جو راستہ تو تھیں راہنما نہیں۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پانی کا گیلن تو اس کے پاس ہی رہ گیا ہے اس کے بچّے پیاسے ہوں گے۔

گاڑی تو اسی وقت چلی گئی تھی جب وہ ریلوے اسٹیشن کے نل پر پانی بھرنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی مگر ہر نیا آنے والا اسے پیچھے کر کے خود آگے لگ جاتا۔ ٹرین کے چلے جانے کا احساس تو اسے اس وقت ہوا جب ٹرین کا آخری ڈبہ اسٹیشن کی آخری حدوں کو چھُو رہا تھا۔ بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دَم نہ تھا کہ وہ دوڑ کر اس آخری ڈبے پر سوار ہو جاتی۔ حالات کی سنگینی نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ اس نے انہیں پکارنے کے لئے مُنھ کھولا جنھیں وہ اپنا سمجھتی تھی۔ مگر آواز نہ نکلی بس نمکین پانی تھا جو اس کی آنکھوں سے مسلسل بہتا چلا جا رہا تھا۔

وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کی بہو نے اسے ٹرین کھُلنے سے ذرا دیر پہلے قصداً اُتار دیا تھا تاکہ گاؤں کی زمینیں جو کہ ساس کے نام تھیں بیچ کر شہر میں اچھا سا فلیٹ لے سکے۔ بیوی کے بہکانے پر بیٹے نے جب

بھی ماں سے زمین بیچ ڈالنے کی بات کی تو نہ صرف اُس نے بلکہ سارے گاؤں نے اس کی مخالفت کی۔ گاؤں والوں نے تو دبے لفظوں میں اس وقت بھی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ جب اس کا بیٹا جو شہر گیا تھا پڑھنے، مگر وہیں شادی کر کے گھر داماد بن بیٹھا تھا۔ ماں نے اکلوتے بیٹے کی لغزش سمجھ کر اسے معاف کر دیا تھا اور کھلے دل سے بہو کو قبول کر لیا تھا۔ بیٹے نے کئی بار ماں کو شہر لے جانا چاہا۔ مگر ماں کی خود داری نے گوارہ نہ کیا۔ کہ وہ اپنا گاؤں اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے در پر جا پڑے۔ اس سال بھی جب وہ چھٹیوں میں گھر آیا تو ماں سے زمین کے معاملے میں ناراضگی ہو گئی اور وہ دو دن بھی نہ رہا شہر واپس چلا گیا۔ ماں دل مسوس کر رہ گئی۔

مہینوں کے بعد بہو اس کے پوتوں کے ساتھ اس کو لینے آئی تھی۔ اپنے بیٹے کی بیماری کا حال سن کر وہ بے قرار ہو گئی، اور بہو کے ساتھ شہر آنے کو تیار ہو گئی۔ وہ پہلی بار گاؤں سے اتنی دور جا رہی تھی۔ گاؤں والوں نے پیار کے ساتھ رخصت کیا تھا اور جلد واپس آنے کی التجا کی تھی۔ جنکشن پر گاڑی تین منٹ سے زیادہ نہیں رکتی تھی۔ بہو نے موقع غنیمت جان کر ساس کو اس کے پوتوں کا واسطہ دے کر آخری منٹ میں پانی کا گیلن تھما کر اسٹیشن پر اتار دیا۔ اور وہ بھیڑ میں یوں گم ہو گئی جیسے چاولوں کے ڈھیر میں کوئی ننھی سی کنکری ......

ایک جم غفیر پورن بابو زندہ باد کے نعرے لگاتا ٹڈی دل کی طرح آگے بڑھا۔ اور وہ پٹریوں پر جا گری " اوہ بچ بچ " کی کئی آوازیں اُبھریں مگر اسے سہارا دینے والے ہاتھ کسی کے پاس نہ تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ دنیا ہے یہاں خود ہی سنبھلنا پڑتا ہے۔

بھیڑ میں کسی شناسا چہرے کو تلاش کرتے کرتے اس کی آنکھیں جواب دینے لگیں۔ وہ تھک کر زمین پر بیٹھ گئی۔ گاڑیاں آئیں اور گذر گئیں وہ دیکھتی رہی کیوں کہ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ ہر گاڑی کی منزل ایک نہیں ہوتی۔ تفکرات کی موجوں میں ڈوبتے اُبھرتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر سو گئی۔

آنکھ کھلی تو اسے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں اپنے ارد گرد چند سکے چمکتے دکھائی دئے جو آتے جاتے لوگوں نے شکستہ حال بڑھیا پر ترس کھا کر اس کے قدموں میں ڈال دیئے تھے۔ اس کی آنکھوں تلے

اندھیرا چھانے لگا - وہ جو گاؤں کی بڑی ماں تھی - اس کے دَم سے کتنے ہی گھر پلتے تھے، آج اس حال میں اسٹیشن پر بھٹکتی پھری تھی کہ لوگ اسے بھکارن سمجھ بیٹھے تھے - فرطِ غم نے اُسے نڈھال کر دیا - کچھ دیر تک بے حس و حرکت وہیں پڑی رہی - پھر اُس نے وہ سکّے موڑے اور اپنے سے کچھ دور پر بیٹھے اندھے فقیر کے کشکول میں یہ کہہ کر ڈال دیئے - "میرے بچّوں کے صدقے میں کہ اللہ انہیں خیر و عافیت سے منزل تک پہنچائے -"

رات ہونے کو تھی وہ آخری اُمید ہار کر آہستہ آہستہ ریلوے اسٹیشن سے باہر آگئی - شہری آبادی میں داخل ہونے کے بعد اُس نے کئی دروازے کھٹکھٹائے کہ کوئی اس کی بپتا سن لے، اسے اس کے گاؤں پہنچا دے - لیکن سب نے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ دن بھر میں بہت سے ایسے اپنا دکھڑا لے کر آتے ہیں - وہ کس کس کی سنیں کوئی راستہ بھول جاتا ہے، کسی کے پاس روپے ختم ہو جاتے ہیں کوئی راہزنی کا شکار ہو جاتا ہے، کوئی اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے - تو کوئی فساد سے متاثر ہوتا ہے - کبھی زلزلے سے متاثروں کے لئے چندہ تو کبھی سیلاب زدگان کے لئے امداد" جا بھئی معاف کر" کہہ کر سب نے جان چھڑا لی -

اس نے تو سوچا تھا، پہلا دروازہ ہی اس کے لئے پناہ گاہ ثابت ہوگا اور لوگ مسافر سمجھ کر اسے رات گذارنے کی جگہ دے دیں گے - وہ بھی تو گاؤں میں آنے والے اجنبی مسافروں کی یوں خاطر مدارات کیا کرتی تھی جیسے وہ اس کے مہمان ہوں اور خاص طور پر اس کے گھر ہی آئے ہوں لیکن دروازے اس کے لئے کھلتے ضرور تھے کبھی سوکھی روٹیاں تو کبھی چونّی اس کے ہاتھ پر رکھ کر بند ہو جاتے اور وہ باہر ہی کھڑی رہ جاتی -

انسانوں سے مایوس ہو کر اس نے بھگوان کے گھر پناہ لینے کی سوچی کیوں کہ اس کے دروازے تو کسی کے لئے بند نہیں ہوتے - اس کی نظر میں تو سب برابر ہیں - اس نے پیپل کے پاس مندر کے چبوترے پر اپنا بدن ٹکایا - آنکھ لگنے کو تھی کہ پجاری نے کہا - " ماتا جی یہ سونے کی جگہ نہیں - جاؤ کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈو" اس نے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دیا - لیکن پجاری پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برہم ہو کر بولا " دھرم شالہ سمجھ رکھا ہے کیا ؟ جاؤ بھگوان کے سونے کا سمے ہے، مجھے مندر بند کرنا ہے "- اس نے گھنٹا بجانا شروع کر دیا - ٹن ٹن کی گونجتی آواز میں اس کی فریاد کہیں گم ہو گئی - وہ بمشکل مندر سے باہر آئی -

اور انجانی سمت بڑھ گئی ۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ آگے بڑھتی چلی گئی ۔ کچھ دور پر اُسے مسجد کے منارے چمکتے دکھائی دیے ۔ اُمید کی کرن اس کی آنکھوں میں لہرائی وہ اپنی تمام تر قوت جمع کر کے مسجد کی طرف چل پڑی ۔ لیکن مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی مؤذن نے اُسے دروازے پر ہی روک دیا جو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آ رہے تھے ۔ " اماں تم اتنی رات گئے کہاں مسجد میں گھسی چلی آ رہی ہو ، مسجدیں عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں " ۔ " بیٹا جاڑے کے دن ہیں ، میں مسافر ہوں اپنوں سے بچھڑ گئی ہوں میری مدد ..... " اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی مؤذن صاحب نے مسجد سے ملحق اپنی کوٹھری میں اپنی بیگم کو آواز دی " سنتی ہیں ..... کچھ دے دلا کر رخصت کیجیے " ۔ اور خود آگے بڑھ گئے ۔

اس نے مسجد کی سیڑھیوں پر ہی آرام کرنا مناسب سمجھا اور تن ناتواں کو ہی اپنا اوڑھنا بنا کر وہیں دراز ہو گئی ۔ فجر کی اذان دینے مؤذن صاحب مسجد کی طرف آئے تو گٹھری کی صورت سیڑھیوں پر پڑی دیکھ کر اسے جھنکایا ۔ ترس کھا کر اپنا انگوچھا اس کے حوالے کیا اور بولے ۔ " اماں تم اب تک یہیں پڑی ہو ۔ اٹھو یہاں سے ابھی نمازی آئیں گے ۔ وہ اس جگہ اپنی جوتیاں رکھتے ہیں ۔ انہیں تکلیف ہوگی ، بوڑھی آنکھیں یا سیت سے بھر گئیں ، ان کا انگوچھا وہیں چھوڑ بھوک سے نڈھال تن اور غم سے بوجھل من لئے وہ آگے بڑھ گئی ۔

کسی نے ماں کہا کسی نے ماتا مگر اس چھوٹے سے لفظ کا تقدس ان کی سمجھ سے بالاتر تھا ۔ اب وہ بے حد تھک چکی تھی ۔ اس نے اس عمارت کی دیوار سے لگ کر بیٹھ جانا مناسب سمجھا جس کے آنگن میں لگے نیم کے پیڑ کی آدھی سے زیادہ شاخیں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں ۔ وہ ایک پرائمری اسکول تھا ۔ ننھے منے بچے اپنے اپنے بزرگوں کی انگلیاں تھامے اسکول آ رہے تھے ۔ آج ان کے اسکول میں فنکشن تھا جس میں انہیں رنگا رنگ پروگرام پیش کرنا تھا ۔

گیارہ بجے پروگرام ختم ہو گیا ۔ جلدی چھٹی ہو جانے کی وجہ سے بچے بہت خوش تھے ۔ کچھ بچے گیٹ کے باہر نیم تلے اپنے بڑوں کے انتظار میں کھڑے تھے ۔ اچانک ان کی نظر اس پر پڑی ۔ پہلے تو وہ ڈرے لیکن ابھی ابھی تو انہوں نے " دا اولڈ پوور وومن " THE OLD POOR WOMAN نظم کو ڈرامے کی صورت ادا کیا تھا ۔ ان کی نظم کا یہ جیتا جاگتا کردار دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا ۔ بچے اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے ۔ بچے ، جو صرف پیار پانا اور دینا جانتے ہیں ۔ بچے ، جو ابھی گیتا ، قرآن ، بائبل

اور گرد گرنتھ صاحب سے نابلد تھے۔

سردی کی شدت کا احساس کرکے ننھی منی آشا نے اپنا شال اس کے بدن پر ڈالا۔ گڑیا سی نور فاطمہ نے بھی اپنا اسکارف اس کی طرف بڑھایا۔ چھوٹے سے نونیت نے بچا ہوا ناشتہ اس کے حوالے کیا۔ اور فلپ نے آگے بڑھ کر اپنی پانی کی بوتل اس کے پاس رکھ دی اور سب مل کر گانے لگے۔

"The old poor woman

Comes from the moon."

(۱۹۹۳ء)

عزم

"مبارک ہو بیگم رمضان کا چاند ہوگیا" کلیم صاحب گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ان کی تینوں بیٹیاں بھی دوڑتی ہوئی ان کے قریب آگئیں۔

"ابو آگئے... ابو آگئے"۔ کا شور سن کر شہناز بیگم باورچی خانے سے نکل آئیں اور سر کا آنچل برابر کرتے ہوئے بولیں۔ "آپ کو بھی مبارک ہو۔ مگر یہ اتنا سارا کیا اُٹھا لائے ہیں؟"

"بھئی ہم نے تو رمضان کا چاند اپنے آفس میں ہی دیکھا تھا۔ اُدھر سے واپسی میں سحری کے لئے کچھ لیتے آئے ہیں لیجئے سنبھالئے۔" "ابو میں بھی لوجا لکھوں گی" (ابو میں بھی روزہ رکھوں گی) ننھی فائزہ نے اپنی توتلی زبان میں کہا جو ابھی صرف تین سال کی تھی۔ کلیم صاحب آنگن میں بستر پر بیٹھ چکے تھے۔ "آہا تو ہماری بٹیا بھی روزہ رکھے گی۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے فائزہ کو پیار سے گود میں اُٹھالیا۔ صائمہ اور ناظمہ بھی اپنے ابو کے قریب چلی آئی۔

"اوں ہوں، اتنی سی تو ہیں روزہ رکھیں گی۔ آٹھ سالہ صائمہ تنک کر بولی۔

"اس طرح نہیں کہتے بھئی۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا" تیرہ سالہ ناظمہ نے بہن کی سرزنش کی۔ اس بیچ شہناز بیگم ناشتہ لگا چکی تھیں۔ "آپ منہ ہاتھ دھولیں ناشتہ لگ گیا ہے۔"

"آؤ بیٹی فائزہ، تم میرے پاس آجاؤ۔" انہوں نے فائزہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

کلیم صاحب فریش ہو کر آگئے۔ ناشتے کے دوران فائزہ سے پیار بھری باتیں بھی ہوتی رہیں۔

کلیم صاحب الکٹریسٹی بورڈ میں سروس کرتے تھے۔ صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک سخت ڈیوٹی انجام دینے کے بعد اتنی سیلری مل جاتی تھی کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کرسکیں۔ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں کبھی بھی بیٹوں سے کم نہیں سمجھا تھا۔ اللہ کی اس نعمت کو وہ اپنے گھر کے لئے رحمت تصور کرتے تھے۔ رمضان المبارک کا پہلا عشرہ گذرتے ہی عید کی تیاریاں زور پکڑنے لگیں۔ شہناز کپڑوں کی سلائی اچھی کرلیتی تھیں۔ لیکن لڑکیاں بضد تھیں کہ اس بار وہ کشیدہ کاری کیے ہوئے ریڈی میڈ سوٹ ہی لیں گی۔

"ہماری بٹیا کیا لے گی؟" کلیم صاحب نے ناظمہ سے پوچھا۔

"ابّو یہ دیکھئے۔ میں نے تینوں کے سامان کی ایک لسٹ بنائی ہے۔" کلیم صاحب نے فخریہ بیٹی کی طرف دیکھا اور بولے "بھئی واہ ہماری بیٹی تو بہت سمجھدار ہے۔ لائیے ذرا ہم بھی دیکھیں کیا کیا ہے آپ کی فہرست میں؟" "ابو، ابو آپی نے میری تولیاں نہیں لیکھیں۔" (آپی نے میری چوڑیاں نہیں لکھیں) "تمہاری چوڑیاں نہیں آئیں گی، تم فوراً توڑ ڈالتی ہو۔" صائمہ نے اسے چڑایا۔ فائزہ رونے کو تھی۔

"کیوں ستا رہی ہو صائمہ؟ تمہاری ننّھی سی بہن ہے۔ شہناز بیگم نے پیار بھرے غصے سے کہا۔

"بیگم ایسا کرتے ہیں کہ رمضان کی ۲۵ تاریخ کو شوپنگ کے لئے چلیں گے۔ تب تک سب کی چھٹیاں بھی ہوجائیں گی۔ کلیم صاحب نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور سب اس پر متفق ہوگئے۔

رمضان کی ۱۵ تاریخ تھی۔ اس دن کلیم صاحب جلد ہی گھر آگئے۔ "کیا ہوا آج جلد گھر آگئے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شہناز بیگم گھبرا کر بولیں۔ "ہاں بھئی۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ ہمارا شہر بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے۔ ربھا گلبور کے اندوہناک فساد نے ہمارے شہر کی فضا کو بھی مسموم کرنا شروع کردیا ہے۔ آج ہمارے آفس کے سامنے سے ایک زبردست جلوس گذرا ہے۔ اس جلوس میں اشتعال انگیز نعرے لگائے جارہے تھے۔ کسی بھی امکانی ہنگامے کے پیش نظر آفس بند کردیا گیا۔ راستے بھی تقریباً بند ہی تھے۔ بہت مشکل سے یہاں تک آپایا ہوں۔" کلیم صاحب نے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے

تفصیل بتائی ۔ شہناز بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے شوہر بعافیت گھر آگئے ۔

"ہماری گڑیاں کہاں ہیں بھئی ؟" کلیم صاحب نے گفتگو کا رُخ بدلا ۔

"آج ان تینوں نے ہماری دعوت کی ہے ۔ افطار کے لئے نہ جانے کیا کیا بن رہا ہے ؟" وہ مسکراتے ہوئے بولیں ۔ اتنے میں فائزہ آگئی ۔ "اَلے ابّو آپ ابھی چھے آدئے ؟ اب تیا ہودا ۔" (ارے ابّو آپ ابھی سے آگئے ۔ اب کیا ہوگا ؟) ننھی فائزہ اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی ۔ "بھئی آج تو ہم ظہر کے وقت ہی افطار کریں گے ۔" کلیم صاحب نے فائزہ کو ڈرانے کے انداز میں کہا ۔

"آپی ..... باجی ، ابّو آدئے ۔" فائزہ دونوں بڑی بہنوں کو اطلاع دینے کے لئے باورچی خانے کی طرف دوڑی ۔ "بیگم ذرا دیکھئے ۔ کہیں یہ بچیاں اپنا ہاتھ واتھ نہ جلا بیٹھیں ۔ میں ذرا دیر آرام کروں گا ۔" کلیم صاحب تھکی ہوئی آواز میں بولے ۔ انہیں نئے اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا تھا ۔ شہر کی فضا ہر لمحہ بگڑتی جارہی تھی ۔ کب کہاں کیا ہوجائے ۔ یہ کہنا بڑا مشکل تھا ۔ اگرچہ کالونی میں ملی جلی آبادی تھی ۔ ان کے پڑوسی چترنجن بابو ان کے بہت اچھے دوست تھے مگر بگڑتے ہوئے حالات نے انہیں کافی پریشان کردیا تھا ۔

شام کو افطار کئی طرح کی چیزیں تھیں ۔ بچیاں بہت خوش لگ رہی تھیں ۔ "ابّو یہ میں نے بنایا ہے ۔" ناظمہ نے دہی بڑوں کا پیالہ آگے بڑھایا ۔ "ارے واہ ! ہمیں تو آج پتہ چلا کہ ہماری بٹیا کھانا پکانے کی بھی ماہر ہے ۔"

کلیم صاحب نے ناظمہ کا حوصلہ بڑھایا ۔ "ابّو وہ اسکول میں ہوم سائنس کے پریکٹیکل میں یہ سب کرنا پڑتا ہے ۔" ناظمہ ٹھہر ٹھہر کر بولی ۔ "آپ نے کیا بنایا صائمہ بیٹے ؟" انہوں نے دوسری بیٹی سے پوچھا ۔ "میں نے فروٹ چاٹ بنائی ہے ۔" وہ جھجک کر بولی ۔ "تبھی تو اتنی مزیدار ہے ۔" کلیم صاحب مسکرائے ۔ ننھی فائزہ بھلا کیوں کسی سے پیچھے رہتی ۔ اس نے کھجور کی پلیٹ آگے بڑھائی "ابو یہ میں نے" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ سب زور سے ہنس پڑے ۔

اگلے دن اتوار تھا ۔ شہناز بیگم شوہر سے مخاطب ہوئیں ۔ "دیکھئے تو امّی جان کا خط آیا تھا ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہم اس سال عید وہیں منائیں ۔" "اچھا اچھا لائیے اور کیا لکھا ہے ؟" کلیم صاحب خط کھولتے

ہوئے بولے ۔ "بھئی اِس سال تو بڑے بھیّا بھی بنارس سے آرہے ہیں ۔ امّی نے لکھا ہے کہ وہ ستائیسویں روزے کو پہنچ جائیں گے ۔ شہر کی فضا اچھی نہیں ۔کیوں نا ہم بھی چلیں؟" "ہاں ہاں ضرور" ۔کلیم صاحب راضی ہو گئے ۔

"کہاں جائیں گے ابّو؟" ناظمہ نے پوچھا ۔ "آپ کی دادی جان کے پاس ۔" "واہ واہ خوب مزہ آئے گا ۔" صائمہ خوش ہو کر بولی ۔ "ابّو چلیں نا ۔" فائزہ اپنے ابّو کا ہاتھ پکڑ کر بولی ۔ "ارے بٹیا آج آج نہیں ۔ دو چار دن بعد چلیں گے ۔ ابھی شوپنگ بھی تو کرنی ہے اور آپ کے لئے چوڑیاں بھی تو لینی ہیں ۔" وہ بیٹی کو پیار سے چمکارتے ہوئے بولے ۔

ابھی یہ خوش گپیاں جاری تھیں کہ اچانک ایک زوردار شور ہنگامے نے سب کو چونکا دیا ۔کلیم صاحب باہر کی طرف لپکے ۔لیکن شہناز بیگم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا ۔کہاں جا رہے ہیں؟ جانے کیا بات ہو؟"

"ذرا دیکھوں تو باہر یہ کیسا ہنگامہ ہے؟" یہ کہہ کر وہ چھت کی طرف لپکے ۔ اوپر پہنچے تو فضا دھوئیں سے پوری طرح بھر چکی تھی ۔ کالونی کے کچھ مکانات جل رہے تھے ۔ پاس پڑوس کے مکانات میں بھی چنگاریاں پہنچ چکی تھیں ۔ "یا الٰہی خیر!" ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔

چترنجن بابو کو ان کی چھت پر دیکھ کر چلّائے ۔ "یہ یہ سب کیا ہے؟" کلیم صاحب یہ دیکھنے کا وقت نہیں ہے ۔ہماری کالونی پوری طرح فساد کی لپیٹ میں آگئی ہے پلیز کچھ کیجئے ۔ فون کے تار بھی کاٹ دیے گئے ہیں ۔" وہ پریشان تھے ۔کلیم صاحب لرز گئے ۔ ان کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا ۔ وہ دو دو چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور بیوی کو کھڑکیاں دروازے بند کرنے کو کہا ۔

شور و غل ہر لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا ۔گولیوں اور بموں کے دھماکے ان کے گھر کے قریب سنائی دے رہے تھے ۔ ان دھماکوں کے بیچ عورتوں اور بچّوں کی دلخراش چیخیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں ۔ بہت سے پرندوں نے بھی خوف و دہشت سے اپنے آشیانے جلنے کے لئے چھوڑ دیے تھے ۔ کچھ گدھ پاس کے درختوں پر ڈیرہ ڈال چکے تھے ۔ انہیں ان کی خوراک کی خوشبو یہاں کھینچ لائی تھی ۔ تینوں معصوم بچیاں الگ سہمی کھڑی تھیں ۔خوف و ہراس نے سب کے چہرے زرد کر رکھے تھے ۔ شہناز بیگم نے تینوں کو اپنے کلیجے سے لگا لیا ۔ جیسے ایک مرغی چیل کے خوف سے اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے ۔ دعاؤں کا ورد

جاری تھا، سب کے حلق خشک تھے۔ آنے والے لمحات کا تصور انہیں خوفزدہ کئے دے رہا تھا سب کے بدن پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔ بھاگلپور کے فساد کی خبریں سب کی آنکھوں میں زندہ ہو گئیں۔ خوشیوں بھرا آنچل پل بھر میں آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

کلیم صاحب حد سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں آنگن میں ٹہل رہے تھے۔ فسادی غنڈے کسی بھی لمحہ ان کے مکان میں داخل ہو سکتے تھے۔ انہیں خود سے زیادہ اپنی بیوی اور بچیوں کی فکر تھی۔ ان کے ذہن کے اسکرین پر معذور دوشیزہ ملکہ، چندیری گاؤں، بھاگلپور شہر میں زبردست خونریزی، جنگلوں اور کھیتوں سے برآمد ہونے والی بے گناہوں کی لاشیں، نوجوان عورتوں اور معصوم لڑکیوں کی بے حرمتی یہ سب ایک فلم کی مانند چل رہے تھے۔ ان کا بدن پسینے سے تر تھا اور چہرہ فق۔ اگلے پل کیا ہونے والا ہے یہ سوچ کر وہ لرز رہے تھے۔ فسادیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

چھوٹے بھائی کا دیا ہوا ریوالور نکال کر انہوں نے دروازے کے قریب ہی مورچہ سنبھال لیا تھا۔ لیکن اس میں صرف چار گولیاں تھیں۔ اب تو پڑوس کے گھر سے چیخنے چلّانے کی آواز آرہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اب ان کے گھر کی باری ہے۔

"یا میرے اللہ مدد فرما"۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے دعا مانگی۔ وقت بہت کم تھا۔ اُن کے مرنے کے بعد ان کی بیوی بچیوں کا فسادی درندے کیا حشر کریں گے؟ اب وہ کیا کریں؟

آخر کار انہوں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر ہی لیا۔

اگرچہ یہ فیصلہ ان کی روح میں نشتر لگا رہا تھا لیکن وہ مجبور تھے، بے بس تھے۔ اگر وہ یہ فیصلہ نہ کرتے تو بعد کے حالات اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتے تھے۔ ان کی تیرہ سالہ بچی ان کی نوجوان بیوی کے ساتھ یہ فسادی درندے کچھ بھی درندگی کر سکتے تھے اس تصور سے ہی وہ کانپنے لگے۔ شہناز بیگم، ناظمہ، صائمہ اور فائزہ کو دیکھ کر انہیں اپنی لاچاری کا شدید احساس ہوا۔ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ آگ کی لپیٹیں اب ان کے گھر تک آرہی تھیں۔ اب تو کسی بھی لمحے فسادی ان کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے۔

انہوں نے ساری طاقت و ہمت جمع کی۔ اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور سخت

ذہنی اذیت کے عالم میں دروازے تک کئی چکّر لگائے، ریوالور کئی بار ان کے ہاتھ سے گرا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا تھا اس کا تصوّر ہی سوہان روح تھا۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں تو اگلا منظر سامنے آگیا۔

فائزہ کی پیار بھری باتیں، ناظمہ، صائمہ کا پیار، شہناز بیگم کی محبت یہ سب مل کر انہیں انکے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کوئی صورت ہی نہ تھی۔ نجات کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک .... دو ...... تین۔ چار ٹریگر دبا۔ اور پلک جھپکتے ہی ان کی تینوں معصوم بچیوں اور بیوی کی لاشیں ان کے سامنے خاک و خون میں نہائی ہوئی تڑپنے لگیں۔ حیرت سے پھٹی آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔ ہنستے مسکراتے چہرے پل بھر میں ساکت ہو گئے۔ کبھی نہ بولنے کے لئے۔

نہیں .... نہیں وہ چیخ اُٹھے۔ وہ ایک نئے عزم سے اُٹھے بچیوں کو بیوی کے سپرد کر کے ریوالور ان کے حوالے کیا اور خود مضبوط ڈھال بن کر دروازے پر جم گئے۔

(۱۹۹۰ء)

دوئینن

خانہ بدوشوں کے آجانے سے آم کے باغیچے میں بہت چہل پہل تھی ۔ کپڑے کے چند ٹکڑوں کو جوڑ کر بانس کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا اور تنبو کی شکل دے دی گئی تھی ۔ اطراف میں انکے مویشی آزاد پھر رہے تھے اور ان کی عورتیں بھی ۔ دھان، گیہوں یا دوسری فصل کے موقع پر یہ خانہ بدوش مختلف گاؤں میں ڈیرہ ڈالتے تھے اور آس پاس کے علاقے سے مانگ کر اتنا اناج جمع کر لیتے تھے کہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا تھا ۔ گاؤں میں آنے کی خبر لوگوں کو بعد میں لیکن کتوں کو پہلے ہو جاتی تھی ۔ کتوں کے بھونکنے اور ان کے چیخنے سے آس پاس کا علاقہ گونجتا رہتا تھا ۔

اس بار انھوں نے جس گاؤں کو اپنا پڑاؤ بنایا' یہ پورنیہ کا وہ علاقہ تھا جہاں 'کلاہ والے' آباد تھے ۔ جنہیں عرف عام میں کلھیا کہتے ہیں ۔ ان کی آمدنی کا خاص ذریعہ زراعت ہے ۔ چھوٹی موٹی تجارت اور دکانیں بھی ۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں ۔ ایک ہی گاؤں میں کلیتہً چار محلے ہوتے ہیں، جو ٹولہ کہلاتا ہے ۔ ایک بازار ہوتا ہے جو ہاٹ کہلاتا ہے ۔ ان کی بہوئیں اپنے ناموں کی بجائے اپنے میکے کے نام سے پہچانی جاتی ہیں ۔ جیسے بشن پور سے بیاہ کر آنے والی "بشن پوریا" ۔ سر ویلی سے بیاہ کر آنے والی "سر ویلیا" ۔ بڑے یا چھوٹے گھروں کی عورتیں بیڑی، حقہ دھڑلے سے پیتی ہیں ۔ سسرال میں

شوہر سے بڑے تمام رشتہ داروں سے پردہ کرتی ہیں۔ یہاں دو وقت کھانے میں چاول پکنا امارت کی نشانی ہے جبکہ روٹی کا پکنا ان کی کم حیثیتی کو ثابت کرتا ہے۔

آم کا مہینہ آرہا تھا۔ آتی گرمیوں نے جہاں آم کے پیڑوں کو ہرے غلاف پہنائے تھے وہیں آم کی کچی بوروں نے ان پر بوٹے سے جڑ دیے تھے۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی " پی کہاں " سے فضا گونجتی رہتی تھی۔ ننھی منی کیریوں پر اب لڑکے بالوں کی نظر تھی کہ کب وہ ذرا بڑی ہوں اور کب وہ ان کا مزہ لیں۔

خانہ بدوشوں نے آم کے باغ میں ڈیرا ڈالا تو گاؤں کی نئی نئی جوان ہوتی لڑکوں کی ٹولی آم کے پیڑوں پر بسیرا کرنے لگی۔ وہ ان کی عورتوں کو کام دھام کرتے، ناچتے گاتے اور نہاتے دھوتے دیکھ کر سیراب ہوا کرتے تھے۔ لیکن خانہ بدوشوں کی خاصیت یہ تھی کہ نظارے بازی کی حد تک تو انہیں گوارہ تھا لیکن کوئی ان کی عورتوں کو بہکائے یا چھوئے بھی تو وہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔

وہ بھی انہیں میں سے ایک تھی۔ نام کی سانولی اور اسم بامسمیٰ۔ سولہ سترہ سال کے سن کی۔ پورے چہرے پر اس کی بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ بدن پر میلی سی دھوتی۔ دوہری تہری گھٹنوں سے کچھ نیچے تک لپیٹے۔ مٹیالے پتھروں کی دو تین مالاؤں سے ڈھکے۔ تیل میں چپڑے بال۔ قرینے سے جمے ہوئے جوڑوں میں ارمول کے پھول۔ کانوں میں تار میں گتھے پتھر اور ناک میں بڑی سی پیتل کی لونگ۔ پاؤں میں بڑی جھانجھریں اس کے چلنے سے بج اٹھتی تھیں۔ وہ ایک جنگلی گلاب کی مانند تھی۔

آج وہ کاندھے پر پوٹلی نما جھولا اور ہاتھ میں المونیم کا پیالہ لئے چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتی مکھیا کی ڈیوڑھی کی طرف جارہی تھی۔ راستے میں ادھ ڈھکے بچے اس کے پیچھے ہو لئے۔ آتے جاتے مرد اور عورت اسے نظر بھر ضرور دیکھتے۔ وہ تھی ہی ایسی!

آنگن میں قدم رکھتے ہی کتوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح ادھر سے ادھر دوڑتی پھری۔ مکھیائن اپنے دو منزلہ پختہ عمارت کی چھت پر تھیں۔ شور و غل سن کر ہانپتی کانپتی نیچے اتریں اور آنے کے ساتھ ہی کرخت دار آواز میں " آن تہ لاٹھی رے '' کا نعرہ لگایا۔ کتے اس جملے سے

بخوبی واقف تھے۔ اس لئے آہستہ آہستہ سرک گئے۔ پھر بھی سانولی کے ہاتھوں پر دو تین خراشیں لگ چکی تھیں اور اس کی دھوتی بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر جمار کھا تھا جیسے اپنے بے قابو دل کو پکڑ رکھا ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں خوف سے کچھ اور بڑی ہو گئی تھیں۔ جوڑا کھُل کر پھول تو جانے کب مٹی میں مل گیا تھا۔ گلے میں پڑی مالائیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ محمدیہ والی مکھیائن جب تک اسکے قریب پہنچیں وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور آنکھوں سے گرتے لڑھکتے آنسو زمین میں جذب ہونے لگے۔

" کیتھی لی ایلاس مورے لی " انہوں نے آتے ہی پھٹکارا۔ سانولی مسلسل روئے جا رہی تھی مکھیائن نے ادھر اُدھر دیکھا، آنگن میں کوئی نہیں تھا۔ لمحہ بھر پہلے جو بچے جمع تھے وہ بھی جا چکے تھے۔

" ہے کھینپوریا " انہوں نے اپنی نوکرانی کو آواز دی۔ کھینپوریا نل پر کپڑے دھو رہی تھی۔ نل چونکہ آنگن کے پچھلی طرف تھا۔ اس لئے اُسے اس حادثے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ مکھیائن کے دو تین بار پکارنے پر وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

" کی بوبو ؟ " اس نے ساری کے پلّو سے پسینہ پونچھا اور سوالیہ نظروں سے سانولی کی طرف دیکھا۔

" چولھا پر سے بھات اتر لے نی کی ایگنا سے روانہ بھے جیسا ہے "۔ انہوں نے نوکرانی کو لتاڑا۔

" ہم تہ کل تر نوا دھوئے چھلان۔ ہے ای کے چھی ؟ " کھینپور والی نے صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سوال کیا۔

" آمک باڑی کر پھکر نیا چھی ہے۔ دھان دے دہک " مکھیائن نے سانولی کا تعارف کراتے ہوئے اُسے دھان دینے کو کہا۔

" کی نام چھو گے ؟ " مکھیائن نے اس سے پوچھا۔

" سانولی " جواب ملا۔

" اَسکلا کینتھی لی ایلاس لے " مکھیائن نے اس کے اکیلے آنے پر اعتراض کیا۔

سانولی نے بتایا کہ اس کا باپ پچھلے دنوں مر گیا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اب اس کا کوئی مالک نہیں۔ ابھی وہ سردار کی دیکھ ریکھ میں ہے۔ اس سال اناج جمع کر لے گی تو اگلے سال سردار قبیلے ہی کے کسی مرد سے بیاہ دے گا۔ اتنے میں کھینپور والی دھان لے آئی۔

سانولی نے اپنی پوٹلی کھول کر اناج اس میں رکھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اب اس کے ہاتھوں میں بڑی سی قمچی تھی جو اُسے مکھیائن نے کتوں سے بچنے کے لیے دی تھی۔ وہ ڈیوڑھی سے باہر آگئی۔ مکھیائن اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

فقیر محمد چوکیدار کے لڑکے بشیر کو گزرتا دیکھ کر انہوں نے آواز دی۔ بشیر فطرتاً اوباش نوجوان تھا۔ لچھے دار باتیں کرنا اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ لنگی گنجی پہنے کاندھے پر سرخ انگوچھا ڈالے وہ اکثر ہاٹ پر نظر آتا تھا۔ لیکن آج کل آم کا باغ اس کی تفریح کا مرکز تھا۔

"کی بات چھی بوڑھ میاں" اس نے اپنا انگوچھا دائیں کندھے سے بائیں کندھے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ مکھیائن نے سانولی کو آم کے باغ تک پہنچانے کے لئے کہا۔ اور سانولی سے بولیں جا چل جا اس کے ساتھ راستے میں کتا جھپٹے گا نی" پھر وہ اندر چلی گئیں۔

"چل گے" بشیر نے دائیں طرف سر کو جھٹکا دیا، جس سے اس کی پیشانی پر آئے بال جھٹکے سے پیچھے ہوگئے۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ جیسے من کی مراد پوری ہوگئی ہو۔ وہ گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا "کون دیسا میں لیکے ...." سانولی ڈری سہمی اس کے پیچھے چل دی۔

شام کے وقت گاؤں کی مختلف حیثیت کی عورتیں مکھیا کے گھر جمع ہوئیں تو گفتگو کا موضوع وہی خانہ بدوش تھے۔ اتنے میں مکھیائن کی خلیری بہن جو اسی گاؤں میں بیاہی تھیں، آگئیں۔ اُن سے بیڑی کی مہک برداشت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی سگریٹ پی لیا کرتی تھیں، لچھن پوریا سے بولیں۔ "اک ٹا سگریٹ لے لے آہیتو ہے۔" پھر اپنی بہن سے مخاطب ہوئیں:

"گے بوبو تُن لہان چھ کی بھکیر وا سینی باتیک کرَ درد ک دوا جانے چھی۔"

بوڑھی پڑوسن بولیں: "ہمَر تہ مٹھوا لاگے چھی کی چھکے نی چھی۔"

کسی کی کمر میں درد تھا، کسی کے گھٹنے میں۔ غرض اس طرح کے مسائل زیر بحث آتے رہے۔ جن کا علاج اِن فقیروں کے پاس تھا۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی سب اُٹھ گئیں اور اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں۔

نوجوان لڑکیوں کو بھی ایک تفریح ہاتھ آگئی اور وہ بھی ان کے کھیل تماشوں سے لطف اندوز

ہونے کے لئے آم کے باغ کی طرف چل دیں۔ یہاں کی رونق ہی اور تھی۔ قبیلے کی عورتوں نے سارا دھان اکٹھا کیا اور دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بٹ کر اوکھل میں اُسے کوٹ کر چاول بنا رہی تھیں۔ اوکھل میں پڑتی موسل کی دھمک اور ان کی کمر میں بندھے کمر زیب کے گھنگھرو فضا میں نغمگی بکھیر رہے تھے اور وہ ایک سُر ہو کر گا رہی تھیں۔ "کٹھیا لدی لہیا ریمی جھمی پانی کے لہیا دھیرے چل۔" کچھ لڑکیوں نے ان سے پتھر کی مالائیں خریدیں، سُرمہ اور سندور بھی۔

کافی دن بیت چکے تھے۔ کتوں نے بھی بھونکنا کم کر دیا تھا۔ لڑکوں کی ٹولی بھی ایک ہی منظر دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھی۔ لیکن ایک خاص بات یہ ہوئی کہ سانولی اور بشیر کئی جگہ ایک ساتھ دیکھے گئے تھے۔ گاؤں میں کھسر پُسر ہو رہی تھی۔ سانولی کے بدلتے معمولات اس کی ساتھی عورتوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ ہر صبح اس کا سجنا سنورنا، اُسے سب کی نظروں میں مشکوک کر رہا تھا۔

دوسری بار وہ مکھیائن کے یہاں آئی تو اس کے ساتھ ایک لنگڑا مرد بھی تھا۔ شاید امیدوار تھا اس کا۔ لنگڑے کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی جس کے سرے پر دو گھنگھرو لگے ہوئے تھے اور لاٹھی کے زمین پر ٹکنے سے بج اُٹھتے تھے۔ سر پر پھٹی ہوئی ٹوپی، بدن پر پرانی چیک کی شرٹ اور لنگی پہنے، بغل میں جھولا دبائے وہ کسی چوکنا پہرے دار کی طرح سانولی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کتوں نے انہیں دیکھ کر اسٹارٹ لیا۔ لیکن چھَن چھَن بولتی لاٹھی دیکھ کر صرف غرّا کر رہ گئے اور صرف دور ہی سے بھونکتے رہے۔

دوسری خانہ بدوش عورتیں بھی اپنے اپنے جھولے کنٹھے اُٹھائے گھر گھر گھومتی پھریں۔ کہیں جڑی بوٹی کہیں تیل تو کہیں جائفل، کہیں ہینگ تو کہیں پھٹکری دے کر بدلے میں اناج لے کر اپنے ڈیرے واپس چلی گئیں۔

اب لنگڑا سائے کی طرح سانولی کے پیچھے لگا رہتا۔ کسرتی بدن والے بشیر کو دیکھ کر سانولی کی آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں مگر لنگڑے کی وجہ سے وہ دور ہی رہتی تھی۔ بشیر اکثر نیم کا دتون دانتوں میں دبائے ان کے راستے میں کھڑا ملتا۔ لنگڑا کینہ توز نظروں سے دونوں کو گھورتا اور سانولی کے مدھم پڑتے قدموں پر اپنی گھنگھرو لگی لاٹھی سے تیز چلنے کے لئے ٹھوکا دیتا۔ سانولی کے چہرے کی چمک اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغامات کے تبادلے اس کے راز کھول دیتے۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور سانولی تو مشک ہی مشک تھی۔ سو اب لنگڑے کا شک

یقین میں بدلتا جارہا تھا۔ بشیر کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا پر منھ سے کچھ نہیں کہتا۔ اس رات اس سے برداشت نہ ہو سکا اور سانولی سے باز پُرس کی تو بحث نے جھگڑے کی صورت اختیار کرلی۔ صبح جب وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر باہر نکلی تو لنگڑا بھی اپنا جھولا کندھا لئے تیار کھڑا تھا۔ سانولی نے اسے دیکھ کر بُرا سا منھ بنایا۔ نفرت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ لنگڑے نے بھی اسے اس طرح دیکھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔ سردار پاس ہی بیٹھا اپنی کلہاڑی تیز کر رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لنگڑے کے ساتھ چل پڑی۔ آج وہ دھن ٹولہ جا رہے تھے۔

وہ لوگ ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ سامنے سے بشیر آتا دکھائی دیا۔ لنگڑے نے سانولی کو بازو سے پکڑ کر دوسرے راستے کی طرف گھما دیا اور دانت پیس کر موٹی سی گالی بشیر کی طرف اُچھال دی۔ سانولی رُک گئی تھی۔ لنگڑا بار بار اُسے آگے چلنے کے لئے ٹھوکے دے رہا تھا۔ گالی بشیر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

"گالی بولا کی ہ؟" وہ لنگڑے سے بھڑ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ سانولی کے چیخنے پر لوگ جمع ہو گئے۔ اور دونوں کو الگ کیا۔ لنگڑے کے منھ سے خون بہہ رہا تھا۔ بشیر کا کاندھا بھی کپڑے سمیت کٹ گیا تھا۔ لنگڑا سانولی کو گھسیٹتا ہوا سردار کے پاس لے گیا اور ساری روداد کہہ سنائی۔ سردار نے سانولی کو پیار سے سمجھایا۔ پھر سختی سے منع کیا کہ وہ باز آجائے۔ لیکن وہ بشیر سے چھپ چھپ کر ملنے لگی۔ سردار نے اس کے باغیچے سے باہر جانے پر روک لگا دی اور لنگڑے کو اس کا نگراں مقرر کر دیا۔ لیکن اب بشیر ہی ان کے ڈیرے پر چلا آتا تھا۔ سردار نے اسے تنبیہہ کی لیکن وہ نہ مانا پھر اس نے گاؤں کے مکھیا سے شکایت کی لیکن بے سود۔

خانہ بدوشوں کے لئے یہ بڑی معیوب بات تھی کہ ان کے یہاں کی کوئی عورت کسی غیر قبیلے کے مرد میں دلچسپی لے۔ سردار کو بھی اس بات کی فکر تھی۔ اس کے خیال میں اگر سانولی کو نہ روکا گیا تو اس قسم کے عشق کا مرض وبا کی صورت ان کے قبیلے میں پھیل جائے گا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اگلے دن کوچ کا اعلان کر دیا۔

سانولی کی ساتھی لڑکیاں سردار کے ڈر سے اس سے کٹی کٹی سی رہتی تھیں۔ لیکن اس کی ہم عمر دلاری نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ باغ سے باہر نکلے آج چوتھا دن تھا۔ اس کے بدن کے کپڑے چکٹ ہو رہے تھے۔ گردن پر میل جمنے لگی تھی۔ خوبصورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ دانہ پانی سے ناراضگی نے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں ڈال دی تھی۔ دلاری کے سمجھانے پر آج وہ گھاٹ پر نہانے آئی تھی۔ لنگڑا ہاٹ گیا ہوا

تھا۔ خشک جگہ پر کپڑے رکھ کر دونوں نہانے میں مصروف ہوگئیں۔ جانے کدھر سے بشیر وہاں آنکلا۔ دلاری بھاگ کھڑی ہوئی۔ بشیر کو دیکھ کر سانولی کے لبوں پر بے ساختہ پھیلنے والی مسکراہٹ نے اس کے پپڑی جمے ہونٹوں سے خون نکال دیا۔ بشیر نے انگوچھے میں بندھی اُبلی ہوئی شکر قندیں اس کے حوالے کیں اور رات کو قبرستان میں ملنے کا وعدہ لے کر چلا گیا۔

اس گاؤں میں خانہ بدوشوں کی وہ آخری رات تھی۔ بہت اندھیری، ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دے۔ آخری تاریخوں کا چاند کچھ دیر رہ کر غائب ہو چکا تھا۔ فضا میں حبس تھا، طوفان کا پیش خیمہ۔ ہوا کچھ دیر چل کر تھم سی جاتی تھی۔

سانولی گُربہ قدمی سے قبرستان کی طرف چل دی۔ جھانجھریں اس نے اتار کر رکھ دیں جو اس کے چلنے میں بج اُٹھتی تھیں۔ وہ سانس روک کر آدھا راستہ طے کر چکی تھی لیکن سردار بے خبر نہ تھا۔

دوسرے روز ہی خبر آئی کہ مکھیائن کا پُرانا خادم دکھن ٹولہ کا بوڑھا بجرو لب گور ہے۔ وہ اسی وقت لچھمن پوریا کے ساتھ اُسے دیکھنے چل پڑیں۔ آم کا باغیچہ راستے میں پڑتا تھا۔ بیچ باغ میں دونوں ٹھٹھک کر رُک گئیں۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ باغ کا سب سے چھوٹا پیڑ تھا جس میں پھول تو آئے پر پھل نہیں۔ کتے دائرے کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہے تھے۔ اوپر کوؤں نے کائیں کائیں لگا رکھی تھی۔ ان سب کی توجہ کا مرکز دو انسانی آنکھیں تھیں جو تاریں گتھی، شاخ سے لٹک رہی تھیں، جنہیں کبھی انسانوں کے لئے مقناطیسی کشش تھی۔ اب یہ بے نور اور تن سے جدا تھیں۔ خانہ بدوشوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

پاس ہی کہیں ریڈیو بج رہا تھا ــــــ

کا گا سب تن کھائیو، چُن چُن کھیّو ماس
دو نینن مت کھائیو، جن پیا ملن کی آس

(۱۹۹۲ء)

پارس

"تُم نے مجھے بھی کوئی پتھر سمجھ رکھا ہے کیا؟ پتھروں کا کاروبار کرتے کرتے خود بھی پتھر ہوگئے ہو۔ لیکن میں انسان ہوں انسان سمجھے! میرا بس چلے تو....." وہ آج سارا زہر انڈیل دینا چاہتی تھی۔ بدری پرساد اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلاس اسے کھینچ مارا "تو کیا ایں تو کیا"۔ اگر کانتا جُھک نہ گئی ہوتی تو بلاشبہ پیشانی پر شگاف پڑ گیا ہوتا۔ بدری پرساد مغلظات بکتا دروازے سے باہر نکل گیا۔

تیواری اپنی جواہرات کی دوکان بندی کرنے والا تھا کہ بدری کو سامنے سے آتا دیکھ کر رک گیا۔

"کیا ہوا؟ منہ کیوں بنا رکھا ہے؟" تیواری نے دوکان کا شٹر واپس اوپر دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

"یار میں تو اس روز روز کی چخ پخ سے تنگ آگیا ہوں"۔ بدری بھنّایا ہوا تھا۔

"کیسی چخ پخ"؟ تیواری کی سمجھ میں نہ آیا۔

"ابے وہی بیوی۔ بیوی۔ روزانہ ایک بار گھر سے نکلتے سمئے اور گھر میں داخل ہوتے سمئے جھگڑتی ضرور ہے"۔ بدری غصّے سے بولا۔ "اچھا بیویاں جھگڑتی بھی ہیں؟" تیواری دوکان کے باہر کرسی رکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں یار جھگڑتی ہی تو ہیں۔ ادھر سے دیکھ رہا ہوں اس نے باہر آنا جانا بھی شروع کر دیا ہے"۔ بدری خلائیں تک رہا تھا۔

"آخر چاہتی کیا ہے؟ تو اُسے کھانا کپڑا تو دیتا ہے نا؟" تیواری نے اپنی سمجھ سے گویا بڑے پتے کی بات کہی۔

"یار اس کی تو ایک ہی رَٹ ہے 'میں تو پریم کی بھوکی ہوں' پر تو جانتا ہی ہے اپنا پریم تو دھندے سے بندھا ہے"۔ بدری نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

"اماں یار! تو اس سے لگتا ہی کیوں ہے۔ آخر میرا بھی تو قیمتی پتھروں کا کاروبار ہے اور میں بھی تو روزانہ بارہ ایک بجے ہی گھر لوٹتا ہوں۔ جس دن چڑھائی تو کبھو کبھو تو اڈے پر ہی ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اپنی بیوی کو کبھی جوتی سے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں اور وہ بھی مجال ہے ایک لفظ بول دے۔ اس سے تو اپنے مہتو گوالے کی گائے اچھی"۔ تیواری نے اپنا آخری جملہ پورا کرتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔ بدری بھی قہقہے میں شامل ہو گیا۔

"اچھا چھوڑ۔ یہ بتا کہ اگلے ہفتے کا پروگرام پکا ہے نا؟" تیواری نے پوچھا "کون سا پروگرام؟" بدری کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تو بھول گیا یار، پرسوں ہی تو سیٹھ کا آدمی آیا تھا۔ اس بار تو پورا راجستھان چھان مارنا ہے۔" تیواری پُرجوش لہجے میں بولا۔

"چھوڑ بھی یار، پچھلی بار چھ مہینے گذار آئے۔ ریت چھانتے رہے پر ملا پارس۔" تیرا اور سیٹھ کا تو دماغ پھر گیا ہے"۔ بدری سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

مگر اس بار تو میں نے سوچ لیا ہے چاہے جتنے بھی دن لگ جائیں میں تو پارس حاصل کر کے ہی رہوں گا"۔ تیواری نے بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مُکا مارا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے پارس اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ سونے کے ڈھیر پر بیٹھا ہو۔

"اچھا اچھا جا گھر جا تیری گائے تیرا انتظار کر رہی ہو گی"۔ بدری نے مسکراتے ہوئے اور تیواری کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"پر آج تو اپنا ارادہ اڈے پر جانے کا ہے۔ تو بھی چل نا۔ تیری چنبیلی یاد کر رہی تھی۔" تیواری نے ایک آنکھ دبائی اور مکروہ سی ہنسی ہنسا۔ ساتھ ہی بولا" اپنی گائے کا کیا ہے۔ وہ تو کھونٹے سے بندھی ہے جائے گی کہاں"۔

اِس بار دونوں کے قہقہے سنسان ہوتے ہوئے بازار میں گونجے دونوں دوکان بند کر کے اپنی اپنی پیاس بجھانے چل دیئے۔

بدری پرساد اور تیواری کی دوستی بہت پرانی تھی دونوں قیمتی پتھروں کا کاروبار کرتے تھے۔ دونوں کے گھر بھی ایک دوسرے سے زیادہ دور نہ تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں دونوں اکثر جے پور کے دورے پر رہتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے تیواری کے سر پر پارس منی حاصل کرنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ انسان پر ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ مگر کیا شیشے کا بیوپار کرنے والوں کے دل شیشے کے، مٹی سے پیسہ کمانے والوں کے دل مٹی کے، پتھر کا کاروبار کرنے والوں کے دل پتھر کے اور پھولوں کی تجارت کرنے والوں کے دل پھولوں جیسے ہو سکتے ہیں؟ شاید نہیں۔ کیونکہ کاروبار سے بھوک مٹانے کی غرض بندھی ہوتی ہے اور جہاں غرض اور ضرورت جیسی باتیں ہوں وہاں جذبے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ یہی حال رشتوں کا ہوتا ہے۔ انسانی رشتوں میں بھی غرض اور ضرورت سے پرے ایک جذبہ ہوتا ہے اور اس کی شناخت ہی مشکل ہو جاتی ہے۔

اگلے منگل کو سویرے ہی تیواری نے اپنے تمام ضروری کام مکمل کر لئے اور جے پور جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اسے اپنے کام میں مداخلت بالکل پسند نہ تھی۔ وہ بیگ اٹھا کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کی بیوی رتنا نے اس سے صرف اتنا ہی پوچھا کہ وہ کب لوٹے گا۔ تیواری نے اسے ایسے گھور کر دیکھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔ رتنا ڈر گئی۔ اسے اپنا خون خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ اپنے لبوں پر رکھ لئے۔

تیواری غصے سے پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔ رتنا نے اپنا گھلتا وجود بستر پر گرا دیا اور خود کو طویل انتظار کے لئے تیار کرنے لگی۔

تیواری تیز تیز قدم اُٹھاتا بدری کے محلّے میں داخل ہوا۔ یہاں اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

لوگوں کی سرگوشیوں پر دھیان دیا تو جو کچھ سُنا اس پر یقین کرنے کو اس کا دل راضی نہ ہوا۔

دوست کے گھر پہنچا تو دیکھا دروازہ کُھلا تھا اندر داخل ہوا تو بدری کی حالت دیکھ کر اسے لوگوں کی باتوں پر یقین کرنا ہی پڑا کہ رات بدری کی بیوی نے خودکشی کرلی۔ بدری پرساد مضمحل سا زمین پر بیٹھا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ پولس والے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانے کی تیاری کر رہے تھے

بدری اسے دیکھتے ہی چلّایا۔ "جا، چلا جا، گھر جا۔ تجھے پارس کی تلاش ہے نا اندھے۔ پارس تو تیرے گھر میں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کھو جائے، راکھ ہو جائے، جا اسے دل میں چھپالے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے ہاتھوں کے ہالے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تیواری نے بدری کا کاندھا زور سے دبایا۔ اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ ترنا کا زرد چہرہ اور کانپتا وجود نیزے کی انی کی طرح دل میں اترتا محسوس ہوا۔

اب وہ بھاگتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا ـــــ

(۱۹۹۱ء)

سلگتے لمحوں کا کرب

خوشی کی بات ہو یا غم کی، مسئلہ کوئی بھی ہو، وہ دوڑا دوڑا میرے پاس چلا آتا تھا۔ اسکول میں کسی سے جھگڑا ہوا ہو، یا محلے میں کسی کے گھر کے شیشے توڑے ہوں۔ ممی ڈیڈی سے کوئی شکایت ہو یا اسکول کا کوئی فنکشن۔ میں! یعنی اس کی دیدی ہر مشکل میں اس کی پناہ اور ہر خوشی میں اس کی ساتھی تھی۔

مجھے یاد ہے، اس سے میری پہلی ملاقات ـــ

اسکول کے تقریری مقابلے میں وہ شریک تو ہوگیا تھا لیکن موضوع ایسا تھا کہ پریشان ہو اٹھا تھا۔ اس کے ممی ڈیڈی دونوں ہی سروس کرتے تھے اس لئے انہیں اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اس کی مدد کرتے۔ پہلے دن وہ گلاب کے دو پھول لئے میرے گھر آیا۔ ہم اس مکان میں کچھ دن پہلے ہی آئے تھے۔ جو میرے شوہر نے حال ہی میں خریدا تھا۔ کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی۔ پہلے دن اُسے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔ اس نے دونوں سفید گلاب میرے حوالے کئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "نمستے دیدی"۔ میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اندر آنے کے لئے پورا دروازہ کھول دیا۔ دس گیارہ برس کا گورا چِٹّا تیکھے نقوش والا یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ تھی اس سے میری پہلی ملاقات۔

پہلے دن وہ اپنا مدعا گول کر گیا۔ دوسرے دن بھی وہ میرے لئے گلاب کے پھول لیکر آیا۔

میں نے اس سے پوچھا "یہ گلاب تم کہاں سے لاتے ہو؟ کسی کا باغیچہ تو خراب نہیں کرتے؟" "نہیں تو دیدی، بھلا مجھے کیا جرورت کسی کے باغ میں جانے کی، ردی نے کہا، یہی اس کا نام تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دروازے تک لایا۔ اور سامنے اشارہ کرکے بولا "میں وہاں رہتا ہوں۔" میں نے دیکھا وسیع وعریض رقبے میں وہ دومنزلہ عمارت ہرے بھرے پیڑ پودوں کے بیچ سفید بگلے جیسے لگی کنارے کنارے گلاب ہی گلاب تھے۔ ردی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں اپنے باغ کے تئیں فخریہ چمک تھی۔ "ہوں.... اتنے گلابوں کے بیچ رہتے ہو تبھی تو خود بھی گلاب کے پھول لگتے ہو۔" میں نے پیار سے کہا۔ "اوں دیدی آپ تو مجاک کرنے لگیں۔" وہ نخریلے انداز میں بولا۔ "بھئی تم مجھے دیدی ہی کیوں کہتے ہو، آنٹی کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔ "یہ تو راز کی بات ہے۔" وہ ایک پاؤں پر گھوم کر بولا۔ "بھئی ہمیں بھی تو اس راز کا پتہ چلے۔" میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ "اب کیا بتاؤں!" وہ قدرے افسردہ لہجے میں بولا۔ "واستو میں میں اپنی چھوٹی بہنوں کا بڑا بھائی ہوں۔ میرے دوست ابھیشک اور گورو کی ایک چھوڑ دو، دو دیدی ہیں۔ انہیں کوئی پرابلم ہو یا اسکول کا کوئی فنکشن۔ جھٹ سے ان کی دیدی حاضر۔ اب بتاؤں گا انھیں" اس نے چٹکی بجائی۔ اس بیچ میں نے لیمن اسکواش تیار کرلیا اور اس کی طرف گلاس بڑھایا تو وہ بولا۔ "ارے دیدی آپ کو کیسے پتہ کہ میں صرف لیمن اسکواش ہی پیتا ہوں؟" میں نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہلکی چپت لگاتے ہوئے کہا "یہاں بھی تمہیں وہی ملے گا۔"...." ارے.... رے میں تو بھول ہی گیا۔ ممی نے مجھے دہی لانے بازار بھیجا تھا۔" اور وہ غٹاغٹ گلاس ختم کرکے اگلے دن آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے گھر کے سناٹے کا احساس ہوا۔ میری گود میری مانگ بھری ہونے کے باوجود سونی تھی۔ گرچہ سلیم نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے اس محرومی کا احساس ہو۔ ہاں اگر سسرال والے ہوتے تو شاید...... سلیم کا میرے سوا اپنا کوئی نہ تھا۔

تیسرے دن ردی آیا تو لمبی تمہید کے بعد اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ میں نے نہ صرف تقریر لکھ کر دی بلکہ اسے خوب اچھی طرح مشق بھی کرادی۔ مقابلے کا دوسرا انعام جیت کر وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔ اور میرے ہاتھوں میں کپ تھما کر میرے پیر چھونے جھک گیا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر اس کی

پیشانی چوم لی۔ اور میز پر رکھی مٹھائی سے اس کا منہ میٹھا کیا۔

"دیدی، آج آپ کو میرے گھر چلنا ہے۔ میں اپنی ممی سے کہہ آیا ہوں۔" وہ بڑے پیار سے بولا۔

"اچھا شام کو چلوں گی۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "نہیں دیدی، ابھی اسی وقت چلیں نا!" اس نے ضد کی۔ "سلیم لنچ ٹائم میں گھر آتے ہیں انہیں کھانا بھی تو دینا ہوگا۔" یہ سوچ کر میں نے اسے منانے کی کوشش کی مگر وہ خوشامد پر اُتر آیا۔ اور میرے دوبارہ انکار کرنے پر اس نے منہ پھلا لیا۔ اور کٹی کے لئے اپنی چھوٹی انگلی میری طرف بڑھائی۔ اور خود بھیگی پلکیں لئے دوسری طرف گھوم گیا۔ "ارے روی تم تو گیس کا غبارہ ہو گئے۔ اب اُڑے کہ تب۔" میں نے اسے ہنسانے کے لئے کہا اور وہ ہنس پڑا۔ وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولا۔ "آپ کو ابھی چلنا ہے۔ اسی وقت۔" وہ اتنے رعب سے بولا جیسے میرا بڑا بھائی ہو۔ لاچار مجھے تیار ہونا پڑا۔

روی کی طرح ہی اس کے گھر والے بھی خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات گہری دوستی میں بدل گئے۔ اس بیچ ان بچوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں یہ بھول گئی کہ میرا اپنا کوئی بچہ نہیں۔ باہم میل محبت سے رہتے تین سال گذر گئے۔

اس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ وقت گذاری کے لئے میں نے کتاب پڑھنا شروع کر دی۔

"ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں مانتے رہئے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی ہے۔ سب اس پر چلتے ہیں۔ آپ بھی چلتے رہئے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ کاغذات میں ایک خانہ بنا ہوا ہے۔ اس میں اسلام درج کرا دیجئے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے۔ اور اسے نہ چھیڑیئے۔ اور اس میں ڈھلتے رہئے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لئے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے۔ اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے۔"

ابھی میں نے "غبار خاطر" کے شروع کا حصہ ہی ختم کیا تھا کہ گلی میں ہنگامہ سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور سلیم ہڑبڑا کر چھت کی طرف دوڑے۔ ہم ہی کیا محلے کا ہر فرد اپنی اپنی چھتوں پر تھا۔ جیسے اوپر کھلا آسمان ہی

ہیں سائبان دے سکتا ہو۔ ہم سب شدّت خوف وغم سے کانپ رہے تھے۔ چہرے فق اور جسم سرد ہو چکے تھے۔ بم کے دھماکے اب قریب سنائی دینے لگے تھے، فضا میں بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں شعلے لپکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہمارے شہر کے لئے بھی یہ ایک انہونی تھی۔

روی کے گھر گہرا سناٹا تھا۔ تمام روشنیاں گُل تھیں۔ اور چاند کی مدھم روشنی میں وہ سفید سی عمارت بال ودھوا کی طرح لگ رہی تھی۔ ملہوترا صاحب تو فیملی سمیت گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ہاں نرنجن بابو کے گھر کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ سلیم کی طبیعت بگڑنے لگی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور آسمان کو تکتے رہے۔ میں نے وہ رات سجدے میں گذاری۔ پرندوں کی آمد تھی، ہوا میں خنکی گھلنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب صبح کبھی نہ ہو گی۔ پاس پڑوس کے بچے اپنی ماؤں کے کلیجے سے یوں چمٹے تھے جیسے چیل کے خوف سے چوزے مرغی کے پروں میں پناہ لیتے ہیں۔ لیکن صبح ایک اٹوٹ سچائی ہے۔

رات کو ہی شہر میں کرفیو لگ گیا اور ہم سب اپنے اپنے گھروں میں قید ہو گئے دروازے تو بند ہی رہتے، ہاں کبھی کبھی کھڑکیاں کھلتیں تو تازہ ہوا اندر آجاتی۔ گلی میں قبرستان کا سا سناٹا رہتا تھا۔ کبھی کبھی روی اپنے گھر کی کھڑکی میں نظر آتا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف تکتا رہتا۔ روی کے باغ میں پھول مُرجھا گئے تھے۔ گھاس جھلس گئی۔ ہرے پتے زرد ہو رہے تھے جنہیں ہوا جانے کہاں اُڑا لے جاتی تھی۔ کرفیو نے ہمارے بیچ فاصلے بڑھا دیئے۔ نرنجن بابو کسی کلینک میں کمپاؤنڈر تھے انہوں نے دوستی کا حق یوں ادا کیا کہ چھُپتے چھپاتے سلیم کو دیکھنے آتے رہے۔ اپنے پاس سے کچھ دوائیاں بھی دیں۔ اُن کے آنے سے مجھے ڈھارس ملی۔ خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ٹل گئے۔

اس دن سلیم قدرے بہتر تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے ہی دروازہ کھولا۔ روی اپنی ممی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اور اس کی ماں پہلے جھجکے اور پھر گلے لگ کر اس طرح روئے جیسے ندی کا باندھ ٹوٹ گیا ہو، روی بولا۔ ”دیکھ رہی ہو دیدی، باغ اُجڑ گیا ہے۔ سمے سے پہلے ہی پت جھڑ کا موسم آ گیا ہے“۔ اتنا کہہ کر وہ میرے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی ڈھارس بندھائی۔ چائے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

آج کافی دنوں بعد سلیم آفس گئے تھے۔ میں گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ رودی آگیا۔ خلاف معمول بہت خاموش خاموش اور اداس اداس تھا۔ "ہم جارہے ہیں دیدی۔" وہ آنسوؤں سے لبریز آواز میں بولا۔ "کہاں جارہا ہے میرا بھیا؟" میں نے دُلار سے کہا۔ "یہ محلّہ چھوڑ کر"۔ وہ بولا۔ میں چونکی "ہاں دیدی"۔ میں اسی وقت ان کے گھر آگئی۔ اسکی ماں کچن میں تھیں۔ میں نے انہیں کندھے سے تھام کر اپنی طرف گھمایا۔ سوال میری آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ "ہاں نوری، تم نے ٹھیک سنا ہے۔ ہم پرسوں جارہے ہیں۔" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں جو کچھ سوچ رہی تھی وہ کہہ نہیں پارہی تھی۔ میں کچن سے باہر آگئی۔ پھر وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آئیں۔

"نوری.... اب جانے کب ملاقات ہو۔ فرصت کے یہ پل پھر نصیب ہوں یا نہ ہوں۔ آؤ دو باتیں کرلیں۔" پھر ہم دیر تک گذری باتیں یاد کرتے رہے۔ دو دن بہت جلدی بیت گئے۔ میں بجھے دل سے پیکنگ میں ان کی مدد کرتی رہی۔ آخر وہ دن آہی گیا۔ وہ لوگ جارہے تھے۔ "دیدی آگئیں۔" رودی نے میرے پیر چھوئے۔ ٹپ سے دو آنسو میرے پیروں پر گر پڑے۔ میں نے جھٹ سے اسے گلے لگالیا۔ وہ سسک پڑا۔ اس کی بہنیں سونی اور مونی خاموش تھیں۔ رودی کے بابا نے بیٹے کو سمجھایا۔ "رودی بیٹا ہم صرف استھانانترن ہی تو کر رہے ہیں تم چھٹی کے روز آجایا کرنا۔" وہ لوگ چلے گئے اور ہم اپنے ویران خانے میں تنہا رہ گئے۔ ہفتہ بھر میں بہت زیادہ اَپ سٹ رہی۔ رودی کی ممی جاتے ہوئے تلسی کا گملا مجھے دے گئیں۔ کیوں کہ سلیم کو جب بھی زکام ہوتا وہ اس کے پتے پانی میں جوش دے کر پلا دیا کرتیں تو دوا کی ضرورت کم ہی پڑتی۔ شروع میں وہ پودا بالکل سوکھ گیا۔ میں سمجھی یہ بھی ساتھ چھوڑ گیا لیکن میری مسلسل محنت نے اسے پھر سے ہرا کردیا۔ اور مجھے لگا رودی ابھی بھی میرے ساتھ ہے۔

رودی کا گھر "آدرش کنج" جمال صاحب نے خرید لیا۔ اس بیچ ہمارے محلّے کے وہ مکانات جو خالی ہوگئے تھے اور جو ادھورے تھے وہ بھی آباد ہوگئے۔ ایک ایک کمرے میں پورا پورا خاندان آبسا تھا۔ ادھورے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹاٹ کے پردوں سے ڈھک دیئے گئے تھے۔ کہیں بجلی نہیں تھی تو کہیں پانی۔ پھر بھی وہ آباد تھے۔

ایک صبح میں نے دھوپ کے لئے جو کھڑکی کھولی تو "آدرش کنج" میں جو اب جمال منزل کہلاتا

تھا کچھ نئے چہرے نظر آئے ۔ جانے رات کے کس پہر آئے تھے ۔ کئی دن تک پتہ ہی نہیں چلا کہ کون ہیں؟ کیوں کہ وہ بڑے بے تعلق سے رہتے تھے ۔ کبھی کبھی چھت پر بجھے بے کیف و رنگ چہرے تو نظر آتے مگر مردہ مردہ بجھے بجھے سے ۔ ویسے مجھے تو تمام ہی نئے پڑوسی ایسے ہی لگتے تھے ۔ سب کے چہروں میں یکسانیت تھی ۔ آدرش کنج سے مجھے غیر معمولی انسیت تھی ۔ اس لئے وہاں کے نئے مکینوں کے لئے میں خاص طور متجسس رہتی تھی ۔ شاید لاشعوری طور پر میں اس گھر سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی ۔ میں نے ان کے بارے میں سلیم سے پوچھا تو وہ الٹا مجھ پر بگڑ بیٹھے ۔

"تمہیں کیا؟ کوئی ہوں ۔ تعلقات بڑھالو دل کے قریب کرلو اور پھر کوئی گرم آندھی چلے اور ہمیں الگ کردے ۔"

میں اپنی کوششوں میں لگی رہی ۔ ایک دن اخبار والے سے پوچھا تو وہ بولا " دنگا پیڑت ہیں ۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا ۔ اور میں سوچنے لگی " یا اللہ یہ کیسا موسم ہے ۔ لوگ اپنے ہی شہر میں ہجرت کرنے پر مجبور ہیں ۔"

دن جیسے بھی تھے ۔ گذر ہی گئے ۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آگئے ۔ لوگ اب سڑکوں کے علاوہ گلیوں میں بھی آنے جانے لگے ۔ رمضان کا مہینہ اپنے دامن میں مسرتوں کا خزانہ سمیٹ لایا ۔ آسمان سے زمین تک نور کی ایک چادر سی تن گئی ۔ لوگ پرانے غم بھول کر عید کی تیاریوں میں لگ گئے ۔ ہر طرف گہما گہمی تھی لیکن ہمارے محلّے کے بعض گھروں میں کرفیو جیسا سناٹا تھا ۔

چاند رات تھی ان گنت کام تھے لیکن میرا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا ۔ پڑوسیوں کا دکھ ابھی تازہ تھا ۔ میں بیٹھے بیٹھے چونک پڑتی ۔ ہر چہرہ قاتل نظر آتا ۔ سلیم نے مجھے افسردہ دیکھ کر کہا " چلئے مارکیٹ چلیں ۔ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لینی ہیں ۔ اور آپ کے کپڑے درزی کے یہاں تیار پڑے ہیں ۔ میں آفس سے لوٹتے وقت گیا تھا ۔" لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا ۔ میں نے بہانہ تراشا ۔ " ساڑھے چار بج چکے ہیں، میں روزے سے ہوں، کہاں کہاں ماری پھروں گی ۔ انطار کے بعد آپ ہی لے آئیے گا ۔" لیکن وہ بضد ہوگئے ۔

ہم لوگ ٹیلر کے یہاں پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی ۔ ٹیلرنگ ہاؤس کے مالک پرکاش بابو بذات خود موجود تھے ۔ اور ان کی مصروفیت دیکھتے ہی بنتی تھی ۔ " آپ تو بہت مصروف ہیں ۔ بھئی کسی کی دعوت ہے کیا؟" سلیم بولے ۔ " اجی دعوت کیسی ۔ یہ ہمارے کاریگر ہیں نادیو، کمال، اکبر، سلّو یہ لوگ رمضان کے پورے

روزے رکھتے ہیں اور صاحب کام بھی پوری ایمانداری سے کرتے ہیں سو میں ان کے لئے رمضان بھر افطار کا پربندھ کردیا کرتا ہوں۔ اِس بہانے تھوڑا سا پُن میں بھی کمالیتا ہوں" وہ کھیرا چھیلتے ہوئے بولے۔ میں پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی وہ پھر گویا ہوئے۔ "سمے ہو چلا بی بی آپ نے بیکار کشٹ اُٹھایا۔ میں آپ کے کپڑے ماسٹر صاحب کے ہاتھ بھجوا دیتا۔ وہ روز ادھر ہی تو جاتے ہیں۔ اب آ ہی گئے ہیں آپ لوگ تو آج افطار یہیں کیجئے" وہ نہایت ہی خلوص سے بولے۔ "ارے نہیں۔ کشٹ کیسا۔ بازار تو آنا ہی تھا۔ اسکوٹر سے نکل جائیں گے۔ گھر پر سب کچھ تیار ہے" میں نے کپڑوں کا پیکٹ اٹھالیا اور ہم باہر آگئے۔ میں نے سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ سورج کی طرح چمکتی پیشانی لئے وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ کتنی روشنی تھی ان کے گرد۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ خود سوزی کی آگ میں اپنا اکلوتا بیٹا گنوا چکے ہیں۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے۔ جو ایک دکھتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو۔ ہم لوگ گھر پہنچے تو اذان ہو رہی تھی۔ چاند ہو گیا۔

اگلے دن عید تھی۔ عید آئی اور گذر بھی گئی لیکن آگ برسانے والے بادلوں نے شہر دیکھ لیا ہے۔ وہ پھر سے چھانے لگے ہیں۔ فضا پھر سے آلودہ ہوتی جارہی تھی۔ ہر چہرہ ایک سوال ہے۔ کیا ہوگا؟ لوگوں کے چہرے بے کیف و رنگ ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے محلّے کے دو چار گھر اور خالی ہو گئے ہیں۔ جمال منزل کے نئے مکینوں کا سامان بندھا پڑا ہے۔ انہیں کسی محفوظ مقام کی تلاش ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ سب سے چلّا چلّا کر کہوں۔ رکو! نہ جاؤ اپنے گھروں کو چھوڑ کر۔ کبھی گھر تمہیں اپنی حفاظت کے لئے درکار تھا اور آج گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔

(۱۹۹۲ء)

بیچ کا آدمی

آج گلی کا نکڑ "واٹرلو کا میدان بنا ہوا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کیونکہ سرکاری نل اچانک بند ہوگیا اور گلی کے ناکام و نامراد برتن آپس میں ٹکرانے لگے تو جنگ کا سماں بندھ گیا۔ انہی میں مُنیا بھی تھی جس کی المونیم کی دیگچی ایک طرف سے پچک گئی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ اماں کام پہ جاچکی ہے۔ اُس نے اندر رکی سانس باہر چھوڑی۔ "بچ گئی نہیں تو آج دیگچی کی طرح پچکا کر رکھ دیتی اماں، جانے کیا ہوگیا ہے اسے، بات بے بات پیٹ دیتی ہے آج کل۔"

سورج سر پر آگیا تو مُنیا کی ماں بھی لوٹ آئی اور آتے ہی منجھلی لڑکی کو پکارا۔ "نمو او نمو لے..... ناشتہ ہے مل بانٹ کر کھالے اور سُن ابا گیا یا ابھی تک لمبی تانے ہے۔" نمو برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ "ابا بولے کہ وہ پھیری کر کے دوپہر تک آئیں گے اور کھانا ایک آدمی کا جیادہ بنانے کے لئے۔" "ہنہ یہاں بال بچوں کو سوکھی روٹی نصیب نہیں اور حاتم طائی کو دعوت کی سوجھی ہے۔" سلمیٰ نے بُرا سا منہ بنایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی دروازے پر دستک ہوئی۔

"مجید..... او مجید..... کوئی ہے؟"

"یہ سلامت اللہ لگتا ہے، پہلی تاریخ کو ہی کرایہ وصولنے آدھمکا۔ کمبختی کے مارے کو ٹالنا بھی مشکل ہے۔"

وہ بڑبڑائی۔

"مجید...... مجید......" **پھر آواز آئی۔**

"بلّو کو بھیج کہہ دے ابا گھر میں نہیں کل آنا۔" سلمیٰ نے مُنیا کو ہدایت دی۔

"اماں بلّو کو تو بخار ہے۔"

"ہیں..... کب سے؟"

"رات جو سویا ہے تو اب تک نہیں اٹھا۔"

"اری تو پہلے کیوں نہ بتایا۔"

"مجید..... ارے کوئی ہے؟"

"ارے کون ہے کیوں چلّا رہے ہو؟" سلمیٰ جھلّا گئی۔ اسی نے دروازہ کھولا۔

"کرائے کے لئے آئے ہیں۔" سلامت اللہ نے ٹوپی اُتار کر پھر پہنتے ہوئے کہا۔

"بلّو کا ابا گھر میں نہیں ہے، تم کل آنا۔" سلمیٰ نے یہ کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر وہ اندر آگیا۔

"ارے تو کل کونسی لاٹری لگنے والی ہے۔ پچھلے مہینے کا بھی دو سو روپیہ باقی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو دیا کہ کل اگلا پچھلا سب لے جانا، پہلی تاریخ کو ہی آدھمکتے ہو۔"

"صاحب لوگ کب دیتے ہیں، مہینے کے پانچ سات دن نکال کر ہی دیتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا مجھے آرڈر ہے کرایہ آج کے آج وصولنا ہے۔" اس نے زور دیکر کہا۔

"کیا بات ہے سلمیٰ بہن۔ یہ گلّو بھائی کنڈکٹر تھا جو کُھلے دروازے سے اندر چلا آیا۔"

"ہونا کیا ہے بھیا، کسی پر بس نہیں چلتا تو چلے آتے ہیں ہم غریبوں کو ستانے۔ اب آج کے آج ہم کہاں سے کرایہ دیں۔ بلّو الگ بخار میں پھنک رہا ہے، باوا کو کوئی فکر ہی نہیں، میرے ہاتھوں کے پھوڑے الگ دُکھتے ہیں اوپر سے یہ تین لڑکیاں سینے پر مونگ دَل رہی ہیں۔"

سلمیٰ جیسے بھری بیٹھی تھی ٹوکنے پر اگلی پچھلی داستان سناڈالی۔

"کتنا کرایہ دینا ہے؟"

"پچھلا بقایا لگا کر پورے ساڑھے تین سو روپے۔" سلمیٰ سے پہلے سلامت اللہ بول پڑا۔

"اے لو ابھی دس دن پہلے ہی تو ڈیڑھ سو روپے دیئے تھے" سلمیٰ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"یہی تو مصیبت ہے تم لوگوں کا حساب اپنے کھاتے میں ہمیشہ جمع ہی دکھاتا ہے۔

سلامت اللہ موٹی سی کاپی کھولتا ہوا بولا۔

"پچھلے مہینے کے کرایے میں کُل دو سو روپے ہی تو دئے تھے تم نے جبکہ پہلے ہی سے ڈھائی سو چڑھے ہوئے تھے تو ڈیڑھ سو کرائے کے اور پچاس روپے بقایا کاٹ کر اس مہینے ہوئے نا ساڑھے تین سو روپے۔" وہ گلو بھائی کو کاپی دکھاتے ہوئے بولا۔ "اب تم بتاؤ بھائی، رو.... رو کر تو کرایہ نکالتے ہیں اوپر سے کو دو سو ہر مہینے چڑھ جاتے ہیں۔"

"اچھا.... اچھا یہ لے پانچ سو روپے اگلا بھی ایڈوانس میں لے لے بس خوش۔" سلامت اللہ نے جھٹ روپے رکھے اور بنا کچھ بولے کھی کھی کرتا باہر آ گیا مبادہ گلو بھائی روپے واپس نہ لے لے۔

"یہ کیا کرتے ہو گلو بھائی تم کیوں دے رہے ہو ہم تھوڑا تھوڑا کر کے دے ہی دیتے۔" سلمیٰ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"سلمیٰ بہن اب باتوں میں سمے نہ گنواؤ اور ببلو کو لے کر اسپتال جاؤ۔ یہ لو سو روپے رکھ لو کام آئیں گے۔"

"مگر.....؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر گلو بھائی چلے گئے۔

مگر تین چار دن بیت گئے گلو بھائی نہیں آئے۔ اُس دن سلمیٰ چادر اوڑھے تیز تیز قدموں سے کالونی کی طرف جا رہی تھی۔ آج وکیل صاحب کے گھر دعوت تھی اُسے آج بہت کام نپٹانے تھے۔ اس لئے سویرے ہی چلی آئی تھی۔ ابھی کالونی کے موڑ پر ہی پہنچی تھی کہ بدقماش راجہ نے اس کا راستہ روک لیا ساتھ میں اس کے چیلے چپاٹے بھی تھے۔

"کیوں سلمیٰ بی بی ہمارا کام نہیں کرو گی..... استاد کب سے کہہ رہے ہیں ارے تمہیں فرصت نہیں تو مُنیا کو ہی بھیج دو اب تو وہ بھی....." راجہ نے دانت نکوسے تو سلمیٰ گرم تیل میں پڑی ہری مرچ کی طرح پھٹ پڑی۔

"ماروں گی ایسا جھانپڑ کہ بتیسی باہر آجائے گی .... مردود کہیں کا بھاگ یہاں سے ...."

"تمہارے منہ سے تو گالی بھی پھول کی طرح لگتی ہے۔" راجہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کمینے جاتا ہے یا بلاؤں باؤ صاحب کو۔"

"کیا لگتا ہے باؤ تیرا .... بڑا گمان ہے .... ہم تو جیسے تیرے دشمن ہے نا۔" .... "تیرا علاج کرنا ہی پڑے گا۔" سلمیٰ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہاں ..... علاج کرنے ہی کو تو کہہ رہے ہیں بیمار دل کا۔"

"کیا بات ہے کیوں پریشان کر رہے ہو .....؟" یہ دیارام بابو تھے اسکول ٹیچر۔ انہوں نے اپنی پیوند لگی چھتری کو زمین پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"جاؤ جاؤ ماسٹر یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔" راجہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے یہ شور کیسا؟ کیا بات ہے ماسٹر صاحب۔" ڈاکٹر منوہر کا کمپونڈر ڈسپنسری سے باہر آگیا۔ جو قریب ہی تھی۔

"ہونا کیا ہے بابو غریبوں کی کوئی عزت ہی نہیں جس کا جی چاہتا ہے اپنی جائداد سمجھ جو جی چاہے کرتا ہے۔" سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شور سن کر ریٹائر فوجی سلطان خاں بھی اپنے مکان سے باہر نکل آئے۔ حقیقت جان کر انہیں بھی غصہ آگیا۔

"ان سالوں نے اس نکڑ کو باپ کا آنگن سمجھ لیا ہے۔ روز دو چار کی ٹولی میں جمع ہو کر شریف گھروں کی بہو بیٹیوں کو تنگ کرنا مشغلہ بنا رکھا ہے میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

"باپ کا راج ہے کیا ہماری مرضی جہاں جی چاہے کھڑے ہوں۔" راجہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کان کھول کر سن لے آج کے بعد اس موڑ پر نظر آیا تو تھانے میں بند کرادوں گا۔ چل نکل یہاں سے۔" انہوں نے راجہ کو دھکا دیا۔

"ہاتھ نہیں لگانا کیا ..... ہاتھ لگایا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیا کرے گا ..... ہیں؟ کیا کرلے گا" وہ بھی طیش میں آگئے آخر کو کارنر کا مکان تھا مستقل دردسر تو اُن ہی کا تھا۔ اب ماسٹر صاحب کی مداخلت ضروری تھی۔ انہوں نے راجہ کو اشارہ کیا۔ جا بھئی کاہے

کو بات بڑھاتا ہے صبح صبح، چل چل اب نظر نہ آنا اس طرف ۔"

راجہ نے بالوں کو پیچھے جھٹکا دیا، کالر کھڑے کئے اور کھا جانے والی نظروں سے سلمٰی کو دیکھتا ہوا بڑبڑایا " دیکھ لوں گا۔ ناک نہ رگڑوائی تو دیکھیو۔" جاتے ہوئے بھی اس نے کئی بار مڑکر دیکھا۔

سلمٰی چادر کے کونے سے آنسو پونچھتی وکیل صاحب کے یہاں چلی آئی۔ یہاں کھانا بنا کر اسے موہن جی کے یہاں کپڑے دھونے بھی جانا تھا۔

شام کو گھر لوٹی تو نئی آفت منتظر تھی۔ میاں مجید سر پر پٹی باندھے کھاٹ پر پڑے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی۔ " ہائے اللہ یہ کیا ہوا ؟ کیسے ہوا ؟ "

" کیا بتاؤں منیا کی ماں، بس سے دھکّہ لگ گیا ٹوکری الٹ گئی سنترے تو برباد ہوئے ہی سر پھٹا الگ۔ لگتا ہے بخار بھی ہے " ...... ہائے ...... اے ...... اوہ ..... اوہ۔ سلمٰی نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اور زور زور سے کراہنے لگا۔

" کتنی بار کہا کہ یہ پھیری ویری چھوڑ دو اور کہیں پان کی گمٹی لگا لو۔"

" گمٹی لگا لو..... روپیہ تو تیری اماں دے گی جیسے۔" مجید نے برا سا منہ بنایا۔

" ماں کہاں سے دے گی وہ تو خود ہی مجبور ہے ابا زندہ رہتے تو شاید..... "

" ہاں کیوں نہیں ابا تو جیسے کلکٹر تھے نا..... "

" کیوں میرا اور اپنا بھیجہ خراب کرتے ہو میں نے کوئی غلط کہا کیا ؟ "

" بس بس زیادہ بک بک نہ کر میں خود ہی تکلیف سے مرا جا رہا ہوں اور تجھے ٹھیلے اور گمٹی کی پڑی ہے۔"

سلمٰی کو لگا آج کا دن بہت خراب ہے صبح سے ہی لفڑے ہو رہے ہیں۔ باوجود ضبط کے اس کے آنسو نکل آئے۔" ارے میرے تو کرم پھوٹے تھے بیاہ کے بعد ایک نوالہ بھی سکون کا نصیب نہ ہوا۔ ساس سسر زندہ تھے تو دہیج کے لئے طعنے مار مار کر بھیجہ چھلنی کر دیا ایک کے بعد ایک لڑکیاں جنتی رہی تو مار پیٹ الگ۔ ہڈیاں گلا گلا کر گھر گرہستی چلاتی رہی تمہیں تو پھیری کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں سوجھتا اس پر آدھی سے زیادہ کمائی پی جاتے ہو۔ ایسے میں کب تک خود کو جلاتی رہوں گی تم سب کے لئے ہاتھوں میں

بھوڑے ہو گئے لوگوں کے برتن مانجھ مانجھ کر۔ اوپر سے تین تین جوان ہوتی لڑکیاں اور ان ناس پٹے لونڈوں لفنگوں کی ندیدی نظروں سے کہاں چھپاتی پھروں خود کو اور ان کمبختوں کو۔ اتنا سب کہتے کہتے وہ بے قابو ہو گئی اور سامنے کھڑی منیا کی شامت آ گئی۔

"ارے کیسی بدبخت عورت ہے ایک طرف شوہر پھٹا سر لئے مرا جا رہا ہے۔ لڑکا میعادی بخار میں پھنک رہا ہے اوپر سے لڑکیوں کو پیٹ رہی ہے چھوڑتی ہے اسے یا اٹھوں....." مجید کو بھی اب غصہ آ گیا۔

ہنگامہ سن کر پڑوسی جمع ہو گئے۔ ایک آدھ کمرے کے گھروں میں رہنے والے سرکاری نل پر قطار بنا کر پانی بھرنے والے اور اکلوتے سرکاری بیت الخلا سے فیضیاب ہونے والے پڑوسیوں کے لئے یہ روز کا تماشہ تھا۔ آج سلمیٰ تو کل نعیمہ صبح منگلو تو شام گھسیٹو۔

"کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے..... کوئی کام دھام نہیں ہے کیا چلو یہاں سے چلو" گلو بھائی خدائی فوجدار بن کر نمودار ہوا۔

"آؤ آؤ گلو بھائی بہت دن پر آئے۔ اوہ..... او....." مجید کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"ارے یہ کیا ہوا مجید بھائی؟" گلو نے پوچھا۔

"تقدیر کی مار ہے بھیا اور کیا۔" مجید افسردگی سے بولا۔ "ایسا کیوں کہتے ہو بھائی۔"

"کیا بتاؤں جو جمع جتھا تھا صبح صبح پھل منڈی سے ایک ٹوکرہ سنترے بیچنے نکلا تھا۔ شامت کی مار کہ بغیر سگنل دیکھے روڈ پار کرنے لگا۔ بس کیا تھا بچتے بچتے بھی لگ ہی گئی۔ سنترے تو گئے ہی سر پھٹا الگ وہ تو اچھا ہوا کہ دینو ساتھ میں تھا جو مرہم پٹی ہوئی ورنہ جانے کب تک وہیں پڑا رہتا مجھے تو کوئی ہوش ہی نہ تھا۔

"کافی چوٹ آئی ہے، اب تو جو ہونا تھا ہوا، خیر سے جان بچ گئی۔"

"منیا کی ماں نے بتایا تھا تمہارے بارے میں..... کرایہ بھی تم نے ہی دیا..... لوٹا دوں گا بھائی جلد ہی تم فکر نہ کرنا..... آڑے وقت پر کام آئے تمہارا احسان ہے بھائی۔" مجید نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے احسان کیسا..... ایک دوسرے کے کام آنا تو ثواب کا کام ہے نیکی میں پوچھ کیسی۔"

"زمانہ کہاں سمجھتا ہے بھیا۔ ہم تو نصیبوں کو روتے ہیں۔ اپنی تو کٹ ہی گئی جیسے تیسے۔ جوان لڑکی کے

بیاہ شادی کی فکر کھائے جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو مُنیا کی ماں کو اسی کا غم ہے۔ بس آئے دن غم غصہ اسی طرح جھگڑا کر کے نکالتی ہے۔" مجید نے چار جملوں میں آپ بیتی کہہ سنائی۔

"میں ہوں نا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ مُنیا، نو، بھولو جیسی تمہاری بیٹیاں ویسی میری... تم فکر نہ کرو اور پھر مُنیا جیسی من موہنی بٹیا کے لئے تو تمہیں دینا نہیں بلکہ لینا ہے جہیز تم نہیں لڑکا دے گا وہ بھی نقد۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مُنیا کا بیاہ تو میں کراؤں گا یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ راج کرے گی راج۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو گلو بھائی... فقیر کی لڑکی اور محلوں کے خواب۔" سلمیٰ بولی جو چائے اور نمکین بسکٹ لئے پاس آ بیٹھی تھی جو وکیل صاحب کی بیوی نے پرانے ہو جانے پر اسے آج ہی دیئے تھے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی خواہ مخواہ تکلیف کی۔"

"تم کیا کہہ رہے تھے بھیا منیا کے بیاہ کی؟" سلمیٰ نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ میرا دوست عرب میں رہتا ہے بڑی دولت دی ہے اللہ نے اسے، چار چار تو گاڑیاں ہیں اس کے پاس۔ کاروبار تو دیش ودیش میں پھیلا ہے۔ سچ پوچھو تو اُس دن بھی میں اسی سلسلے میں آیا تھا۔"

"تو ان کا لڑکا ہے کیا۔" مجید بول پڑا۔ سلمیٰ نے اسے ٹوکا۔

"میرا دوست رحمدل تو اتنا ہے کہ کسی غریب کو دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی اُس کی مدد کرتا ہی رہتا ہے۔ اب دیکھو نا یہ ہیرے کی انگوٹھی اس نے مجھے تحفے میں دی ہے اور بھی ڈھیروں سامان دیتا رہتا ہے۔"

گلو بھائی نے ہاتھ آگے کیا جس میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ سلمیٰ اور مجید دم بخود تھے۔

"بڑا پکا یار ہے میرا۔" گلو شہد سے بھی شیریں لہجے میں بولا۔

"بس ایک ہی کمی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"وہ کیا... وہ کیا..." سلمیٰ اور مجید ایک ساتھ بول پڑے۔

"ہائے... بیچارے کو عورت کا سُکھ نہیں۔"

"کیوں... کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں بھائی مجید شادی تو کی تھی مگر بیوی بیچ راستے میں ہی ساتھ چھوڑ گئی اور زندگی کے

سفر میں بیچارے کو اکیلا چھوڑ گئی"۔

"ہائے بیچاری کم عمری میں ہی چل بسی"۔ سلمیٰ افسردگی سے بولی۔

"نہیں نہیں سلمیٰ بہن تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ تو بہت بڑے گھر کی اکلوتی لڑکی تھی بڑی آزاد خیال۔ یہاں وہاں آنا جانا۔ اِن سے اُن سے ملنا اسے پسند تھا۔ میرا یار سیدھا سادہ آدمی اپنی باتوں پر ٹوکتا تھا بس ناراض ہو کر چلی گئی۔ ایک دن...... پھر طلاق ہو گئی"۔ گلّو بھائی نے قصّہ طوطا مینا دو لفظوں میں مکمل کر دیا۔

"اُن کی تو عمر بہت ہو گی بھیا اور اپنی مُنیا تو......"

"کمسن ہے۔ یہی نا...... ارے مردوں کی بھی کوئی عمر دیکھتا ہے اور پھر اتنا دولتمند آدمی کسی چیز کی کمی نہیں۔ شاہی ٹھاٹ ہوں گے مُنیا کے اور پھر یہ بھی تو سوچو مُنیا کے بعد نمو اور پھولو بھی تو ہیں۔ اور مُنیا کے لئے کونسا بر دیکھ رکھا ہے تم لوگوں نے کوئی رشید، کوئی حمید لے جائے گا بیاہ کے اور پھر وہی کہانی کیوں؟ گلّو بھائی نے سلمیٰ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مگر......" مجید نے کمزور سی مزاحمت کرنی چاہی۔

"نا..... نا..... جلدی نہیں ہے بھائی تم دونوں سوچ کر جواب دینا ویسے میں نے دو ایک جگہ اور بھی بات چلا رکھی ہے۔ میرا یار تو چالیس پچاس ہزار تک خرچ کرنے کو تیار ہے۔ میں تو تمہارے خاندان کی بھلائی کے لئے کہہ رہا تھا۔ ٹھیک ہے چلتا ہوں پھر آؤں گا"۔

دو دن یونہی سوچ وچار میں گذر گئے۔ دونوں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ آج سلمیٰ صبح صبح جو کام پہ جانے نکلی تو گلی کے موڑ پر راجہ اور اس کے استاد کو کھڑا دیکھ ٹھٹکی۔ وہ کسی انجانے خطرے کا احساس کر کے گھبرا گئی۔ راجہ کی دھمکی یاد آئی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اُلٹے پاؤں گھر آ گئی۔ سلمیٰ کو واپس آتے دیکھ کر مجید کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ دو دن سے پھیری پر نہیں گیا تھا جیب خالی تھی اور حلق سوکھا تھا۔ بھنّا گیا۔

"واپس کیوں آ گئی؟"

"آج نہیں جاؤں گی"۔

"نہیں جائے گی تو فاقے کریں گے ہم سب؟"

"میں نے تم سب کے پیٹ پالنے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔"

سلمیٰ کا تیور دیکھ کر مجید نے نرمی سے پوچھا۔ "صبح صبح کس کا منہ دیکھ لیا؟"

"حرام کے جنے اپنے گھر کی طرف انگلی اٹھا کر جانے کیا گھسر پھسر کر رہے تھے۔ ارے تمہیں دنیا کی کچھ خبر بھی ہے"۔ وہ پھٹ پڑی۔

"کس کی بات کر رہی ہے تو؟" مجید جو اب تک نیم خوابیدہ تھا، اُٹھ بیٹھا۔

"وہی حرامجادہ جو محلّے کا دادا بنا پھرتا ہے۔ سلمیٰ نے اوڑھی ہوئی چادر گول کر کے کونے میں پھینکی۔ مجید اُٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا تو سلمیٰ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کہاں چلے اب کیا اپنی صورت دکھا کر انہیں لڑنے کی دعوت دو گے۔ ڈیڑھ پسلی کے آدمی بہتری اسی میں ہے کہ گھر میں بند رہو۔"

"تو نے مجھے کیا گیدڑ سمجھ رکھا ہے؟"

"شیر بھی تو نہیں ہو کہ میں سینہ تانے گلی پار کر جاؤں۔"

"ڈرتی کیوں ہے؟"

"اُن کے تیور اچھے نہیں۔ مجھے پتہ ہے۔"

"تیرا اُن سے کیا جھگڑا؟"

"تم تو ایسے بھولے بن جاتے ہو جیسے جانتے ہی نہیں"۔ سلمیٰ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو سلمیٰ کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ "وہی ہوں گے"۔ مجید دروازہ کھولنے لگا تو سلمیٰ نے پھر ہاتھ پکڑ لیا، "کیا کرتے ہو حرام کے پلّے گھر میں گھس گئے تو جانے کیا آفت مچائیں اور محلے والے لکڑی کے گھوڑے دادا کے مقابل نہیں آسکتے میری مانو چپکے پڑے رہو۔" دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ ساتھ ہی کسی نے آواز لگائی۔ "مجید بھائی!" دونوں کی جان میں جان آئی کیوں کہ یہ گلو بھائی کی آواز تھی۔ "ہو نہ ہو اللہ میاں ہی نیکی کا فرشتہ بنا کر گلو بھائی کو بھیج دیتے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی بات سوچی۔ مجید نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے سلمیٰ بہن خیریت تو ہے؟" گلو بھائی نے ماحول کا اندازہ لگا کر کہا۔

"غریب کے گھر خیریت کا کہاں گذر بھیا" سلمیٰ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"مُنیا کی ماں کام پر جارہی تھی کہنے پر دادا کو دیکھ کر ڈر گئی۔ بس اتنی سی بات ہے۔" مجید نے کہا

"بات اِتّی سی نہیں گلّو بھائی۔ ان کی نیّت ٹھیک نہیں مُنیا پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔"

"تجھے تو وہم ہوگیا ہے خواہ مخواہ۔" مجید جھلا گیا۔

"بھول گئے پرسوں شام مُنیا کوڑا پھینکنے گئی تھی۔ کمبخت کے مارے نے اس زور سے بازو پکڑ کر گھسیٹا کے سُرخ نشان پڑ گئے وہ تو جھٹکا دے کر بھاگ آئی ورنہ جانے کہاں لئے جا رہا تھا۔ ناس پٹا۔"

"معاملہ گمبھیر ہے مجید بھائی۔ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا میرا دوست تو کب سے تیار بیٹھا ہے آج صبح میں اسی لئے آیا تھا۔"

"ٹھیک کیا جو تم آگئے۔ ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھو۔" سلمیٰ جلدی سے بولی۔ پھر مجید سے مخاطب ہوئی۔ "میں اور تم کب تک پہرہ دیں گے روزی روٹی کے لئے باہر تو نکلنا ہی ہے۔ کل کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو اوپر تلے بیٹیاں ہی ہیں کوئی سر پہ ہاتھ رکھنے والا نہیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مُنیا کی ماں۔" مجید آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہے تو یہ لو پانچ ہزار روپے ابھی رکھو، بعد میں اور بھی ملیں گے۔ مگر نکاح کے پہلے کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلے۔ میرا دوست دکھاوے کا قائل نہیں دو آدمی کافی ہوں گے۔ اور ہاں رقم کو کوئی غلط مطلب نہ دینا۔ غریبوں ناداروں کے کام آنا تو ثواب کا کام۔ اور پھر باقی دونوں لڑکیوں کی بھی تو شادی کرنی ہے بلّو کا اسکول میں نام لکھانا ہے اور تمہیں پان کی گمٹی بھی تو لگانی ہے پھر گھر بھی تو اپنا نہیں اسے تو تم اللہ کی طرف سے مدد سمجھو۔ ہم تو بس ادنیٰ سا ذریعہ ہیں۔" گلّو بھائی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا پھر آسمان کی طرف دیکھا اور کانوں کو ہاتھ لگائے بولا۔ "وہی سب کی مدد کرتا ہے۔

نہ ڈھولک بجی نہ مہندی رچی، نہ پڑوسی آئے نہ بارات۔ بس دو آدمیوں کی موجودگی میں نکاح ہوگیا۔ اور صغرا خاتون عرف منیا شیخ صاحب کی ہوگئی۔ ہفتے بھر کے اندر اس کا پاسپورٹ ویزا سب تیار ہوگیا اور آخری وداعی کی گھڑی آگئی روتے بسورتے بھائی بہن اور شرمندہ شرمندہ سے ماں باپ نے جل تھل آنکھوں سے الوداع کہا۔ مُنیا نے نقاب اوڑھی اور چلی گئی۔ کالے سیاہ نقاب کے اندر ایک اُجلی چمکیلی زندگی قید ہوگئی۔

اندھیرے میں گم ہونے کے لئے۔

مگر اگلی صبح سلمٰی اور مجید کے لئے ہی نہیں پورے شہر کے لئے زلزلے کا پیغام ثابت ہوئی۔ دروازے پر پولیس والے، اخبار والے، ٹی وی والے سب جمع تھے۔ پتہ چلا مُنیا اور شیخ صاحب ایرپورٹ پر گرفتار کر لئے گئے۔ دوسرے لفظوں میں کمسن صغرا بچالی گئی۔

اگر بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو اچھا تھا مگر آج پھر ایک صاحب سنکٹ موچن بنے مسمات رضیہ بی بی کے گھر کا کرایہ ادا کر رہے ہیں جن کی تین نہیں آٹھ لڑکیاں ہیں ان صاحب کے ہاتھ میں آج ایک نہیں دو ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں اور ساتھ میں ہیں قاضی صاحب جن کا تین منزلہ مکان تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

(۱۹۹۵ء)

پروفیسر فراست علی کا خاندان چار نفوس پر مشتمل تھا۔ وہ، ان کی بیوی فاطمہ بیگم اور دو بچے فیصل اور مونا، زندگی نہایت سادہ اور پُر سکون تھی، فراست علی طبیعت کے بڑے صاف اور پُر مذاق تھے لیکن ان کی بیگم اتنی ہی سنجیدہ اور خاموش طبع تھیں، انھیں زیادہ تر اپنے بچوں کی فکر گھیرے رہتی تھی خاص طور پر مونا کی۔ محدود آمدنی، کمر توڑ مہنگائی، بچوں کی پڑھائی اور بیٹی کی شادی۔

صبح کا وقت تھا، پے.... پر کی بے سُری آواز کے ساتھ ہی اخبار والے نے گیٹ کے اندر اخبار اُچھالا اور خود تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ فراست علی اخبار لینے دروازے تک آئے، چونکے بغیر نہ رہ سکے، اخبار کہیں نہ تھا۔ انھوں نے چاروں طرف تلاش کیا، گملوں کے پیچھے بھی دیکھا لیکن اخبار کو نہ ملنا تھا نہ ملا، فیصل بھی ان کے پیچھے چلا آیا تھا۔ "کیا ہوا ابو، کیا تلاش کر رہے ہیں؟" اس نے اپنے والد سے پوچھا۔

"ارے بیٹا ابھی ابھی اخبار والا اخبار دے گیا ہے لیکن یہاں تو کہیں بھی نہیں" فراست علی حیرت سے بولے۔

"کہیں کوئی گیٹ کی درز سے تو نہیں لے گیا"۔ فیصل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ارے نہیں بیٹا اُدھر وہ گیا اور اِدھر میں آیا ہوں" فراست علی کافی پریشان تھے۔

مونا میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی اور آج کل گھر کے کاموں میں اپنی امی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ناشتہ تیار کر رہی تھیں، مونا نے باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو اسے اپنے بھائی فیصل اور ابو امرود کے پیڑ کے نیچے اوپر کی سمت دیکھتے نظر آئے اور فیصل کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی نظر آیا۔

"امی، امی دیکھئے! بھیا صبح صبح کچّے امرود توڑ رہے ہیں، پاس ہی ابو بھی کھڑے ہیں لیکن منع نہیں کر رہے"۔ فاطمہ بیگم کھڑکی تک آئیں انھوں نے بھی حیرت سے دونوں باپ بیٹے کو دیکھا اور مونا کو وہاں جاکر دیکھنے کو کہا۔ مونا باہر چلی آئی۔

"کیا ہو رہا ہے بھیا، ڈنڈا لے کر کیوں امرود کے پیچھے پڑ گئے ہو"۔ ابھی اس نے بات مکمل ہی کی تھی کہ اس کی نظر پیڑ کے اوپر والی شاخ پر پڑ گئی اور یہ دیکھ کر کہ اخبار وہاں اٹکا ہے، مارے ہنسی کے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ فیصل ڈنڈے سے اخبار گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب مارے غصّے کے شٹل کاک بنے ہوئے تھے۔ اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے اور ساتھ ہی بڑبڑا بھی رہے تھے۔

"آنے دو کل اسے، بخشوں گا نہیں کم بخت کو۔"

"ارے بھئی کس کی شامت آئی ہے؟" فاطمہ بیگم بھی ادھر آنکلی تھیں۔

"اس اخبار والے کی تو میں چھٹّی کر دوں گا غضب خدا کا۔ اخبار اچھال یہ جا وہ جا، چاہے پیڑ میں اٹکے یا نالے میں گرے"۔ فراست علی واقعی غصّے میں تھے۔

"اچھا اچھا غصّہ تھوکئے اور سب چلئے ناشتہ کرنے، لگتا ہے بھوک نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے"۔ فاطمہ بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر فیصل اور اس کے والد کالج چلے گئے اور مونا بھی انڈسٹریل ہوم چلی گئی جو اس نے حال ہی میں جوائن کیا تھا۔ گھر کے بقیہ کاموں سے فارغ ہو کر فاطمہ بیگم بستر پر دراز ہوئیں تو جلد ہی سو گئیں۔ اس آمدنی میں اخبار کا خرچ تو نکل سکتا تھا لیکن نوکر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ شام کی چائے سب اکٹھے پیتے۔

شام کے وقت چائے پیتے ہوئے فاطمہ بیگم نے سرگوشی میں شوہر کو مخاطب کیا۔ "میں کہہ رہی تھی آپ کو مونا کی فکر ہے ؟ اگلے چند سالوں میں ہمیں اس کے فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل بیٹیوں کو عزت کے ساتھ رخصت کرنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری، فراست علی نے چشمہ اُتارا اور پھر لگایا۔

"بیگم آپ تو خواہ مخواہ ہی فکر مند ہوتی رہتی ہیں اور اسی فکر میں گھلتی جا رہی ہیں، بھئی ابھی مونا کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں، ابھی سے اپنے ذہن پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں، ننھا سا مغز برداشت نہیں کر پائے گا۔" انھوں نے مذاق میں بات ٹال دی۔ شوہر کے اس اطمینان پر فاطمہ بیگم جل ہی تو گئیں۔

"آپ سے بات کروں تو یوں اطمینان سے فرماتے ہیں جیسے جمع پونجی پڑی ہے وقت آنے پر جھولا کھولا اور انڈیل دیا۔" فراست علی نے وہاں سے اُٹھ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔

دن یونہی گذرتے گئے فاطمہ بیگم کی وہی فکریں تھیں اور فراست علی کی پرانی لاپرواہی۔ ہولی کی چھٹیاں ہوئیں تو سب نے دلی جانے کا پروگرام بنایا، فاطمہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود ان کی ایک نہ چلی اور پروفیسر صاحب کی دلیلوں نے انھیں قائل کر ہی لیا۔

"ایک ہفتے کی تو بات ہے، سب لوگ گھوم آئیں گے اور پھر عرصے سے وجاہت بھائی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اچھا اچھا چلوں گی، کچھ سامان بھی لینا ہے۔ سنا ہے وہاں چیزیں سستی اور اچھی ملتی ہیں، میں نے مونا کے لئے کچھ جمع جوڑ رکھا ہے۔" فاطمہ بیگم نے اپنی کہی۔

"اما بیگم! مونا کے لئے ہمیں بھی کچھ کرنے دیجئے" گویا ہم سے بالکل ہی ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔ زندگی پڑی ہے بھئی، کرلیں گے وہ بھی۔" فراست علی ہنستے ہوئے بولے۔ "ہاں ہاں زندگی پڑی ہے۔ ارے آج مرے کل دوسرا دن، کہتے ہیں زندگی پڑی ہے آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔" فاطمہ بیگم جھنجھلا گئیں۔

رات ہو چکی تھی۔ فیصل گھر نہیں لوٹا تھا فراست علی اپنا قلم تلاش کرتے ہوئے اس کے کمرے تک آئے، یہاں ان کی نظر میز پر رکھے چند معمّے اور کچھ لاٹری کے ٹکٹوں پر پڑی، بہت غصّے میں

واپس ہوئے اور فاطمہ بیگم سے بولے۔

"میں پوچھتا ہوں یہ لڑکا کیا کیا کرتا رہتا ہے۔ کن واہیات چیزوں میں اس کی دلچسپی ہے۔ یہ معمّے، یہ لاٹریاں، دوسرے لفظوں میں جُوا۔"

"ارے کیا ہوا کچھ میں بھی تو سنوں۔" فاطمہ بیگم گھبرائیں۔

"یہ ..... یہ دیکھو صاحبزادے لاٹری کے ٹکٹ خریدتے ہیں، معمّے حل کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی تعلیم پھر ان فضولیات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے کہہ دیجئے گا کہ وہ اپنا دماغ پڑھائی میں خرچ کرے نہ کہ ان فضولیات میں وقت ضائع کرے۔ آئندہ اس قسم کی چیزیں میں اس گھر میں نہ دیکھوں۔" فراست علی نے گویا جملہ چباتے ہوئے بات ختم کی اور بستر پر دراز ہو گئے۔

فیصل گھر میں داخل ہوتے وقت تمام باتیں سن چکا تھا۔ فاطمہ بیگم نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور صبح اس کی خبر لینے کا ارادہ کر کے خود بھی سو گئیں۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں، موسم کی تبدیلی کا اثر ہر فرد پر تھا۔ زکام و بخار وبائی مرض کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

فراست علی بھی کچھ دنوں سے طبیعت میں گرانی محسوس کر رہے تھے۔ ہلکے پھلکے بخار نے اب بیماری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دلّی جانے کا معاملہ بھی اب کھٹائی میں پڑا نظر آ رہا تھا۔

گھر کا کوئی ایک فرد بیمار ہو جائے تو سارا گھر افراتفری کا شکار ہو ہی جاتا ہے اور پھر یہاں تو گھر کے بڑے کا معاملہ تھا جس پر سب کا دار و مدار تھا۔ فاطمہ بیگم بہت پریشان تھیں۔ فراست علی کو کوئی بھی غذا ہضم نہیں ہو رہی تھی، بہت لاغر و کمزور ہو گئے تھے۔ فاطمہ بیگم اور مونا سمجھا کر تھک گئیں لیکن وہ اپنا علاج خود ہی کرتے رہے، اور اپنی بیماری کو بھی مذاق میں ٹالنا چاہا۔ آج فیصل بضد تھا کہ وہ کسی بڑے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ بالآخر بیٹے کی بات ماننا ہی پڑی۔ مختلف ٹیسٹ کے بعد پتہ چلا کہ یرقان ہے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بیچارے بستر سے لگ گئے، کیونکہ آرام اور پرہیز ہی اس کا بہتر علاج ہے اپنی بیماری اور مالی حالت نے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کل اگر انھیں کچھ ہوگیا تو ان سب کا کیا ہوگا، کچھ بھی تو جوڑ کر نہیں رکھا ہے۔ سر چھپانے کے لئے چھت بھی تو کرائے کی تھی۔ فیصل تو لڑکا ہے کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا لیکن مونا؟ انھوں نے صدق دل سے خدا سے مہلت مانگی۔

دعائیں کسی بھی وقت قبول ہو جاتی ہیں بشرطیکہ صدق دل سے مانگی جائیں۔ فراست علی چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو پھر سے تگ و دو شروع کردی لیکن یرقان ایسی جونک ہے جو چمٹ جائے تو سارا خون نچوڑ کر ہی الگ ہوتی ہے۔ بے آرامی نے انھیں پھر بستر سے لگا دیا۔ بیوی اور بیٹی نے تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن فراست علی تو جی ہی چھوڑ بیٹھے تھے۔ انھیں لگتا کہ وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ یہی باتیں فاطمہ بیگم کو خون کے آنسو رلاتی تھیں۔

چھٹیاں تو کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ اب جا کر فراست علی کالج جانے کے قابل ہوئے تھے۔ مالی پریشانیوں نے انھیں عمر سے دس سال آگے دھکیل دیا تھا، پرانے فراست علی کی جگہ ایک کمزور اور لاغر بوڑھے نے لے لی تھی۔

آج کل وہ کالج سے آکر سیدھے اپنے کمرے میں جاتے، اپنا کالا بیگ الماری میں بند کر کے چابیاں جیب میں رکھتے۔ تب اطمینان سے دوسرے کام انجام دیتے۔ فاطمہ بیگم محسوس کر رہی تھیں کہ وہ اس کالے بیگ کو بہت احتیاط اور حفاظت سے رکھتے ہیں انہیں وہ بیگ اب سوتن کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔

ہر بشر فانی ہے اور مقررہ وقت پر اسے جانا ہے، فراست علی بھی اپنے وقت کو نہیں ٹال سکے اور ۹ مئی کی رات چپکے سے آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ کے لئے۔ صبح فاطمہ بیگم اور بچوں کے لئے قیامت لائی تھی۔

اس رات فراست علی نے اپنا کالا بیگ اپنے سرہانے رکھا تھا اور دیر رات تک کاغذات الٹ پلٹ کرتے رہے تھے۔ بیگ کو الماری میں رکھتے وقت ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا جیسے کڑی دھوپ میں پیدل چلتے چلتے سایہ اور پانی ایک ساتھ مل گئے ہوں۔

آج فراست علی کا قُل ہے، فاطمہ بیگم کو اچانک اس بیگ کا خیال آیا۔ انھوں نے الماری

سے بیگ نکالا اور کھول کر زمین پر اُلٹ دیا۔ جیسے وہی قاتل ہو، پنکھے کی ہوا سے لاتعداد لاٹری کے ٹکٹ چاروں طرف بکھر گئے۔ فاطمہ بیگم گنگ سی کرسی تھام کر رہ گئیں، مارے ضبط کے انگلیاں سفید پڑ گئیں جیسے چاروں طرف فراست علی بکھرے ہوں۔ اتنے میں مونا اور فیصل بھاگتے ہوئے اندر آئے اور آج کا اخبار ان کے سامنے پھیلا دیا۔

اخبار کے کونے میں فراست علی کی تصویر چھپی تھی نیچے لکھا تھا :

Bumper Prize winner : Draw 9 May.

(۱۹۹۰ء)

ادھورے خواب

"دورِ جدید نے اوپر والے کے بنائے ہوئے موسموں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ تمام موسموں کا مکسچر ہے۔ کیوں کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی ملک میں الگ الگ رُتیں رہتی ہیں۔ کہیں خزاں تو کہیں بہار، کہیں غموں کی دُھوپ تو کہیں خوشی کی چھاؤں، کہیں آتشیں ہوائیں تو کہیں خون کی بارش۔ غرض اس ملے جلے موسم کی دبیز چادر چہار سو پھیلی ہوئی ہے۔ ملبوسات میں لپٹا تہذیب و تمدن، شیروانیوں، غراروں، دھوتیوں، انگرکھوں، پگڑیوں، صافوں، کرتے پاجاموں اور ٹوپیوں میں سمٹ گیا ہے۔"

"باپ رے باپ، یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟" ہاشم نے وجد کے عالم میں بولتے صفدر کو ٹوکا۔

"دیوانے ہوئے ہو؟" "جی ہاں جی ہاں قرب قیامت ہے اب تو یہ پاگلوں کی زبان ہے کاش ہم سب پاگل اور دیوانے ہوتے۔ اس مطلبی دنیا سے تو انجانے ہوتے۔"

صفدر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "واہ جناب کیا قافیہ ملایا ہے۔ لیکن مجھے اس کا قطعی شوق نہیں ہے نہ آرزو۔ اللہ دیوانگی سے محفوظ رکھے اور یہ صفت آپ ہی کو مبارک ہو میں تو چلا۔" ہاشم جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولا۔

"جا کہاں رہے ہو؟" صفدر نے تیزی سے جاتے ہوئے ہاشم سے پوچھا۔

"آج چھ تاریخ ہے بھائی، آج میرا انٹرویو ہے۔ تمہارے وعظ اور نصیحت نے پہلے ہی ذہن خالی کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا تو کانگے مقدر ہوگا۔"

"لیکن ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں۔ انٹرویو تو گیارہ بجے ہے۔"

"مولوی صفدر الحسن صاحب اس بیچ میں کچھ کام نپٹا لوں۔ اس لئے اجازت دیں اور مہربانی فرما کر دن کے کھانے میں کھچڑی ہرگز نہ پکائیے گا۔ ہاں اور سنیئے سینچر والا عذر بھی نہیں چلے گا۔" ہاشم نے جاتے ہوئے مڑ کر کہا۔

"جو حکم مالک۔" صفدر نے ذرا خم ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور اندر چلا آیا کچھ پل یوں ہی بیٹھا رہا پھر نہانے چلا گیا۔ جونہی نہا کر نکلا دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے مکھرجی کو پایا۔ "ارے مکھرجی آؤ آؤ کیا حال ہے بھئی۔"

"برا حال ہے یار۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"یار ہوسٹل چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاں نیا بیچ آئے گا تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"ایسے تو میں نے بہت سے لوج میں ٹرائی کیا مگر کہیں کوئی سیٹ خالی نہیں ملی، سپریٹ روم کا کرایہ سات آٹھ سو روپے ماہانہ ہے میں کہاں سے لاؤں گا یار۔" وہ اداس ہو کر بولا۔

"ارے تو پریشان کیوں ہوتا ہے۔ یہیں آجا۔" صفدر نے خلوص سے پیش کش کی۔

"یہاں؟ تم دونوں اتنی مشکل سے اس چھوٹے سے کمرے میں رہتے ہو پھر میں کہاں۔"

"جگہ تو دل میں ہونی چاہئے۔" صفدر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تیری محبت ہے یار مگر ہاشم سے تو پوچھ لے۔" مکھرجی بولا۔

"ہم دونوں دو تھوڑی ہیں۔"

"وہ تو ہے بھئی تم دونوں تو ایک جان دو قالب ہو۔" وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"لیکن مہاشے ہیں کہاں دکھائی نہیں دے رہے۔" مکھر جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے مت پوچھو بھئی حضرت انٹرویو دینے گئے ہیں۔"

"انٹرویو؟"

"جی ..... انہیں یہ خبط ہے کہ اِدھر امتحان ختم اور اُدھر نوکری حاضر۔" صفدر نے اسٹوو میں پمپ کرتے ہوئے کہا۔ وہ کھانا بنانے میں لگ گیا تھا۔

"یار تم کیسے یہ کھانا وانا پکا لیتے ہو۔ یہ کام تو عورتوں کے ہیں۔"

"بس جناب جس دن میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون سے کام میرے ہیں، کون سے عورتوں کے، تو سمجھ لو میرا زوال شروع، یار آدمی کو کم از کم اپنے کام خود کرنا چاہئے۔" صفدر بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ٹائم وِسٹ کرنے کے بجائے ہوٹل میں کھانا ہی بہتر ہے۔"

"ہوٹل کا کھانا؟ بھئی اپنا معدہ تو اتنا پا در فُل نہیں کہ ہوٹل کا مُغن و مجرّب پکوان ہضم کر سکے وہ تو تمہیں ہی مبارک۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ آگے کے لئے کیا پلاننگ ہے۔ فائنل امتحان تو ختم ہو گئے رزلٹ آنے میں کم سے کم سال بھر تو لگ ہی جائے گا۔" مکھر جی نے پوچھا۔

"پلاننگ کیا ہو گی یار۔ یہاں تو سیشن اتنا لیٹ ہے کہ آدھی زندگی پڑھنے ہی میں گذر جاتی ہے۔ ویسے میں پرسوں اپنے گاؤں جا رہا ہوں اور آگے بھی وہیں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"لیکن گاؤں جا کر کیا کرو گے؟"

"اور یہیں رہ کر کیا کروں گا، لکھ لو کہ ہاشم منہ لٹکائے خالی ہاتھ واپس آئے گا۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ نوکری ملنا کوئی آسان کام نہیں۔ پر اتنا پڑھ لکھ کر گاؤں میں جھک مارنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"لیکن میں نے کب کہا کہ میں وہاں جھک ماروں گا۔ وہاں مارنے کے لئے بہت کچھ ہے میرے بھائی! وہاں بھوک، افلاس، جہالت جیسے دشمن ہیں۔ ان سے لڑوں گا۔" صفدر بڑے عزم سے بولا۔

"اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔" مُکھر جی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ پہل کرنے کے لئے حوصلہ چاہیئے، حوصلہ سمجھے۔"

"رہنے دو بھائی گاؤں کی حالت دیکھ کر تو رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کھیتی ہر مزدوروں کے پلاین نے کھیت اُجاڑ اور کھلیان ویران کر دیئے ہیں، اور مکھیاؤں کی جیبیں گرم اور گودام بھرے پڑے ہیں۔ چاہے وہ جواہر روزگار منصوبے کی رقم ہو یا وردھا پنشن۔ ان روپیوں سے ان لوگوں نے پختہ مکان بنائے، موٹر سائیکل خریدی، کاروبار بڑھایا بس اب تو سمجھو ان کے دروازے پر ہاتھی بندھنے کی دیر ہے اور غریب جنتا وہیں کی وہیں۔ شوشن سے کہیں چھٹکارا نہیں۔" مُکھر جی نے تقریر کر ڈالی۔

"تو قحط زدہ علاقہ کا ہے نا اس لئے بھرا بیٹھا ہے۔ ریلیکس میرے یار ریلیکس۔"

"اور مان لو ہم ان سے لڑ بھی لیں تو دیوی شکتیوں سے کیسے لڑ پائیں گے۔ کبھی ٹڈی دل تو کبھی سوکھا، کبھی باڑھ تو کبھی طوفان میں تو بھر پایا۔ مکھر جی افسردگی سے بولا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر صفدر جلتے چولہے پر چاول کا اَدھن رکھتے ہوئے بولا۔

"پلاننگ یار پلاننگ جو ہم سوچ سکتے ہیں وہ بھولے بھالے اَن پڑھ لوگ کیا سوچ سکتے ہیں ذرا سوچ ہمارے دماغ، مزدور کے ہاتھ اور کسان کی ہل مل جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔"

"اے بھائی یہ تو کہہ رہا ہے کیوں کہ تو نے ایگریکلچر کی شکچھا لی ہے۔ پر میں کیا کروں گا میں نے تو لار، کا اکزام دیا ہے اور میرا خیال ہے ہاشم بھی یہی کہے گا کیوں کہ اس نے تو لیبر اینڈ سوشل ویلفیئر میں ایم اے کیا۔" مکھر جی خاموش ہوا صفدر تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"میں نے کب کہا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی دیہاتوں میں گنوا کھپا دو۔ مگر کبھی کبھار اک نظر کرم اُدھر بھی وکیل صاحب کم از کم اپنے لوگوں کو مفید مشورے تو دے سکتے ہو۔"

دونوں کھانا بنانے لگے اور باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو مکھر جی نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہاشم کھڑا تھا۔ حسب توقع منہ لٹکائے۔ "سالے، دھوکے باز، جھوٹے، مکار۔" وہ بڑبڑاتا ہوا بستر پر گر سا گیا۔ صفدر اور مکھر جی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے

دیکھا اور مسکرانے لگے۔

"نمک چاہیئے بابو" صفدر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"مت تنگ کر یار" وہ اپنا بازو آنکھوں پہ رکھے لیٹا رہا۔

"اچھا لے پانی پی آگ لگی ہوگی بجھ جائے گی"

صفدر نے پھر کہا۔ "کیا"؟ وہ چلایا۔

"پیٹ میں یار پیٹ میں تین بج چکے ہیں کھانا تو کھایا نہیں ہوگا"

"اور اب کھاؤں گا بھی نہیں" وہ ناراضگی سے بولا۔

"یار غصہ تھوک دے۔ نرم گرم تو چلتا ہی رہتا ہے۔ پتہ ہے آج میں نے جو کھانا بنایا ہے، کھائیگا تو یاد کرے گا" مکھر جی نے اسے سمجھایا تو وہ اُٹھ بیٹھا۔

"ارے یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں پتہ ہے انہوں نے پہلے ہی"..... ہاشم غصے سے بولا۔ "ہم نے پوچھا کیا ہوا؟ چھوڑ بھی اکھانا کھالے" صفدر اسے ہاتھ پکڑ کر غسل خانے کی طرف لے گیا۔ "منہ ہاتھ دھولے ہم کھانا لگا رہے ہیں"

پھر وہ تینوں کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔ گفتگو کا سلسلہ چلا تو ہاشم نے بتایا کہ جس پوسٹ کے لئے وہ انٹرویو دینے گیا تھا اس پر کسی منسٹر کے بھانجے کا اپوائنٹمنٹ ہو گیا تھا باقی سب تو بس فورمالیٹی تھی۔ پھر مکھر جی کا مسئلہ زیر بحث آیا تو ہاشم نے بھی اسے اپنے ساتھ رہنے کی آفر کی اس کا کہنا تھا کہ صفدر تو گاؤں چلا جائے گا ایک سیٹ تو خالی ہی ہو جائے گی مگر یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ صفدر اس کا دوست ہی نہیں بڑا بھائی بھی تھا۔ گرچہ وہ دونوں چچا زاد تھے مگر سگوں سے بڑھ کر تھے۔ دونوں کا بچپن لڑکپن ایک ساتھ گذرا تھا' دونوں ایک دوسرے کے راز دار و غم خوار اور دُکھ سُکھ میں ایک دوسرے کے سچے ساتھی تھے لیکن صفدر کے گاؤں میں سیٹل ہونے پر ہاشم کو سخت اعتراض تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ وہ یہیں شہر میں سیٹل ہو کر ماں باپ، بھائی بہن کو بھی بلالے کیونکہ وہ خود ایسا ہی ارادہ رکھتا تھا۔

اگلے دن مکھر جی مع سامان چلا آیا۔ دو دن خرمستیوں میں گذر گئے۔ آج صفدر کو جانا تھا۔ صبح

سے بحث کے کئی دور چل چکے تھے۔ کھانے پر بھی وہی بات ہو رہی تھی۔ "دیکھو لکھرجی عقل کے دشمن کو، گاؤں جا رہے ہیں بھائی صاحب، پتہ ہے پچھلی چھٹیوں میں اپنا پیر تڑوا آئے تھے۔ بیل گاڑی لکڑی کے پل سمیت نیچے جا گری تھی۔ وہ تو ندی میں پانی کم تھا تو پیر ہی ٹوٹا ورنہ جانے کہاں بہہ جاتے۔" ہاشم نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ صفدر سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ "کیا تو نہیں چاہتا کہ لکڑی کا پل سمنٹ کے پل میں تبدیل ہو۔ کیا اس کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہیں؟ صفدر نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں بھئی یہ کام تو ہر پانچ سال پر گاؤں کے مکھیا اور نیتا حضرات کروا ہی دیتے ہیں الیکشن کے موقع پر، لیکن یار پلاننگ کی داد دینی ہوگی کوئی بھی پل پانچ سال پورے نہیں کر پاتا۔ یعنی یہ ایشو ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔" ہاشم لکھرجی سے مخاطب ہو کر بولا اور اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بھائی میرے اگر تم ہم جیسے لوگ گاؤں کے مسئلوں سے بھاگتے رہے تو ان کا نپٹارا کیسے ہوگا؟ بھگوڑے سپاہی بھی کہیں میدان مارتے ہیں۔ اپنا تو ایک ہی فارمولا ہے 'غازی نہیں تو شہید'۔ صفدر ٹھوس لہجے میں بولا۔ "یار لکھرجی اپنا صفدر مستقبل کا مکھیا لگ رہا ہے نا!" ہاشم نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "یار ہاشم کچھ بھی کہہ لو مگر گالی مت دو"۔ صفدر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گذر گیا۔ "سوری یار مگر تم ہی سوچو نا گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے۔ گھٹنوں تک کیچڑ، ٹوٹی سڑکیں، گرتے پل، بیابان ہوتے کھیت، جاہلیت کا عفریت، دقیانوسی بزرگ، لکیر کے فقیر۔" ہاشم بولا

"کیوں کیا تمہیں گاؤں کی فضا میں اور کچھ محسوس نہیں ہوتا تمہاری آنکھیں وہاں یہی دیکھتی ہیں؟"

"ہاں اور بھی بہت کچھ دیکھتی ہیں میری آنکھیں، برہنہ بچے، نیم عریاں لڑکیاں، آوارہ لڑکے بالے، اندھیرا، مفلسی، چھوٹی ذہنیت کی سیاست، مرغے، بکری کے سوال پر مارا ماری، کھیت کی چودھری کو لے کر قتل و خون، سوائے انحطاط کے اور رکھا ہی کیا ہے وہاں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم گاؤں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو مگر دکھ ہے کہ تم میں ان تمام جراثیم سے لڑنے کا حوصلہ نہیں، بالفاظ دیگر تم بزدل ہو۔"

صفدر ہاتھ دھونے لگا کیونکہ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد پیکنگ کا مرحلہ آیا۔ ہاشم بہت اداس تھا۔

"شکل پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ کیا تو گاؤں کبھی نہیں آئے گا؟" صفدر سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولا۔

"کون جانے!" ہاشم نے مختصراً کہا۔

"پتہ ہے مکھرجی میرے ساتھ جیکسن بھی جا رہا ہے۔"

صفدر نے جیسے دھماکہ کیا۔ اس کی ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"جیکسن؟" ہاشم اور مکھرجی ایک سُر میں بولے۔

"جی.... اُسے انڈین ویلیج پر آرٹیکل لکھنا تھا سو میں نے کہا میرے ساتھ گاؤں چلو اور خود مشاہدہ کرلو۔"

"کیا کہہ رہے ہو صفدر، اسے گاؤں لے جا رہے ہو، ارے کیا عزت رہ جائے گی ہماری، وہ سوچے گا کہ ہم اتنے بیک ورڈ علاقے کے رہنے والے ہیں۔ کم از کم ہمارے تھری پیس سوٹ کا تو خیال کیا ہوتا۔ میری مانو تو نکل چلو وہ آئے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ تم نے ہی دیر کردی اور جہاں تک اس کے آرٹیکل کا سوال ہے تو اسے سریندر کے ساتھ اس کے گاؤں بھیج دیں گے۔ ان کا گاؤں قدرے بہتر ہے کیونکہ منسٹر قدرت اللہ اسی گاؤں کے ہیں۔" ہاشم جلدی جلدی بولا۔

"بس کرو ہاشم بہت ہوگیا تم اتنے خودغرض ہوجاؤ گے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ گاؤں جہاں ہمارے والدین پلکیں بچھائے ہماری راہ تک رہے ہوں گے، جنہوں نے اپنا خون جلا کر تمہیں اور مجھے پڑھایا لکھایا اور اس امید پر اتنی دور بھیجا کہ ہم گاؤں کو سنواریں گے، سدھاریں گے مگر افسوس یہ اس جیسے تمام گاؤں کی دھرتی کی بدنصیبی ہے کہ جانے کتنے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، افسران، ملک ہی کیا ملک سے باہر بھی نام و دولت کما رہے ہیں مگر وہ جس دھرتی کے باسی ہیں اس مٹی کی پکار اُن تک نہیں پہنچ پاتی۔" صفدر پُرجوش لہجے میں بولا۔

"ہونہہ تمہیں تو گاؤں کا بھوت چمٹ گیا ہے۔ ارے ایک کیکٹس اور گاؤں میں فرق ہی کیا ہے۔ وہ بھی ہرا بھرا لگتا ہے مگر کانٹوں سے بھرا ہوا۔" ہاشم بھی اسی جوش سے بولا۔

"میرے دوست کیکٹس کانٹوں سے بھرا ضرور ہوتا ہے مگر اس میں بھی پھول کھلتے ہیں اور

میں انہیں پھولوں کی آبیاری کا ارادہ رکھتا ہوں مجھے متزلزل مت کرو بلکہ تم بھی اپنی آنکھوں سے خود غرضی کا چشمہ اتار پھینکو۔" مکھر جی بڑے غور سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کئی بار کچھ بولنے کی کوشش کی مگر ماحول گرم دیکھ کر خاموش رہا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ صفدر کسی طرح ہاشم کی بات مان لے اور گاؤں میں سیٹل ہونے کا ارادہ ترک کر دے۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پیکنگ لگ بھگ پوری ہو گئی تھی۔ وہ تینوں بستر پر دراز تھے۔

"بھائی صفدر تو آپ کا خیال ہے، ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل بن کر لوگ گاؤں میں سڑتے رہیں۔" ہاشم بولا۔

"میں نے کب کہا کہ وہ اپنا کیریر نہ بنائیں دولت نہ کمائیں مگر گاہے بگاہے اپنی دھرتی کو بھی یاد کر لیا کریں کیا یہ سچ نہیں کہ آج کا انسان ساری زندگی دیارِ غیر میں کولہو کے بیل کی طرح کھٹتا رہتا ہے مگر مرتا ہے تو آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ اسے اس کے آبائی گاؤں میں دفنایا جائے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ کونسا جذبہ ہے جو ساری زندگی ذہن و دل کے کسی کونے کھدرے میں دُبکا رہتا ہے اور بستر مرگ پر اُمڈ آتا ہے۔" صفدر لیٹا نہ رہ سکا۔

"تم فکر نہ کرو میں مر کے بھی نہیں آنے والا۔" ہاشم بے رُخی سے بولا۔

"آخر ارادے کیا ہیں تمہارے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہیں رہوں گا، گاؤں کی اپنے حصے کی زمین بیچ کر یہاں بزنس کروں گا۔" ہاشم حتمی لہجے میں بولا۔

"ہوش کے ناخن لو یہ کیسا زہر اُگل رہے ہو ہاشم۔ مہر بانو کا کیا ہوگا جو تمہارے انتظار کا لمحہ لمحہ صدیوں میں جی رہی ہے۔" صفدر نے اسے یاد دلایا۔

"کون، وہ جاہل لڑکی جسے نہ بولنے کا ڈھنگ ہے نہ بیٹھنے کی تمیز۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاشم ......" صفدر چیخ کر بولا۔ "تم نے کہنے کو تو بہت عام سی بات کہی مگر یہ بھول گئے

کہ تمہاری اپنی بہن مجھ سے منسوب ہے کیا تم نے اسے پڑھایا ہے ؟ کیا تم نے اسے ایٹی کیٹ (Etiquette) سکھائے ہیں ؟"

لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی، گہرا سناٹا کمرے میں در آیا۔

"اماں یار تم لوگ بھی کس بیکار کی بحث میں اُلجھ گئے ہو، لو دیکھو جیکسن بھی آ گیا۔" مکھر جی کرسی کھینچتے ہوئے بولا۔

"ہیلو گائیز" (Hallo guys) جیکسن نے بیگ ایک طرف رکھ کر تینوں سے ہاتھ ملایا۔ صفدر اس بیچ تیار ہو چکا تھا۔

"لیٹ اَس گو (Let us go)" وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"چائے تو پی لو" مکھر جی نے اسٹوو جلانے کی کوشش کی۔

"اب اسے مت گمراہ کر دینا ہاشم، بڑی سوندھی سوچ ہے اس کی گاؤں کے بارے میں۔" صفدر نے سرگوشی کی۔

"بھئی ہم میں سے کوئی یورپ جاتا ہے تو مائیں بہنیں پڑوسیوں کے طعنے سنتی ہیں کہ لڑکا تو گوری میم لے کر آئے گا۔ اب ہم یہ کہیں کہ بھائی جیکسن گاؤں کی گوری لے کر آئیں گے کیوں !" مکھر جی نے جیکسن کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں ہنسنے لگے۔ پھر ہاشم چائے بنانے میں مکھر جی کی مدد کرنے لگا کیونکہ اس سے تو اسٹوو تک نہیں جل سکا تھا۔

"یار تم لوگ بس اسٹینڈ تک جا کر کیا کرو گے یہیں سے الوداع کہہ لو۔" صفدر چائے پیتے ہوئے بولا۔ "کیا بات کر رہے ہو بھئی کہیں واپس آ گئے تو !" مکھر جی سنجیدگی سے بولا اور چاروں کا قہقہہ فضا میں گونجا۔

منوہر ٹرانسپورٹ کی بس نمبر AC-225 روانگی کے لئے تیار تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔

"میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا یار، صفدر نے بھیگے لہجے میں کہا۔ ہاشم کی آنکھیں بھر آئیں۔ مکھر جی نے مداخلت کی۔ "کبھی کبھی ہمیں بھی یاد کر لینا یار۔" انہوں نے

ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

بس چل پڑی تو جیکسن بولا۔ " آئی فیل کریزی (I feel crazy) یار۔ ہندوستانی گاؤں کی طرف یہ میرا پہلا سفر ہے، گرینڈ پا کہتے تھے انڈیا گاؤں کا دیش ہے۔"

" وہ ٹھیک ہی کہتے تھے ہندوستان تو اب بھی گاؤں کا دیش ہے۔ لوگ ترقی کر گئے ہیں گاؤں اپنی جگہ ویسے ہی ہیں۔"

" تمہارا گاؤں کیسا ہے صافدر؟" جیکسن نے پوچھا۔

" دوست! بہار اور خزاں ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ لیکن ان کا آنا اٹل ہے۔ خزاں کے بعد بہار کو تو آنا ہی ہے نا! اچھے بُرے حالات تو آتے ہی رہتے ہیں۔ دراصل گاؤں کے مسئلے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے۔ میرا گاؤں بھی ان میں سے ایک ہے۔ شفاف ندی کے کنارے کچے پکے مکانوں میں بسی لگ بھگ پانچ ہزار کی آبادی، کھیت کھلیان، باغ باغیچے، آزاد منش بھولے بھالے لوگ، بھات اور بتھوے کا ساگ۔" وہ ہنسنے لگا۔

" اچھا یہ بتاؤ، ابھی جو یہاں کا ماحول ہے یعنی ڈنگے فساد۔ کیا گاؤں ان سے بچے ہوئے ہیں؟"

" میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ اس طرح کے وائرس سے محفوظ ہیں مگر ان میں اس طرح کے جراثیم سے لڑنے کی طاقت شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ دراصل ہندوستان کی نوّے فیصد آبادی کا مسئلہ غربت ہے، بھوک، افلاس اور بے روزگاری ہے۔ سیاسی پارٹیاں ان مسئلوں سے دھیان ہٹانے کے لئے اور کرسی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے فرقہ وارانہ دنگے کرواتی ہیں، کاسٹ وار کو ہوا دیتی ہیں۔"

" لیکن یار نقصان تو عوام کا ہوتا ہے نا!" جیکسن بولا۔

" درحقیقت اس کے ذمہ دار ہم ہیں، ہم جیسا بیوقوف شہری شاید ہی کہیں ہوگا۔ ہم سب موم کی ناک والے ہیں جس کا دل چاہا، جدھر چاہا موڑ دیا۔ جس دن ہم نے اپنا محاسبہ کرلیا اس دن ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوم ہوں گے۔"

"لیکن ایسا نہیں ہے یار۔ کاسٹ وار، رائٹس، یہ تو ساری دُنیا کا مسئلہ ہے۔ کیا امریکہ اور یورپ میں گورے کالوں کا مسئلہ نہیں ہے، کرپشن تو ہر جگہ ہے، سوشل اکسپلائٹیشن تو لگ بھگ ہر دیش میں یکساں ہے۔ ڈبے کچلے لوگوں کو تو ہمیشہ دبایا ہی جاتا ہے۔ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہوتا جا رہا ہے۔" جیکسن نے اپنی بات تفصیل سے کہی۔

"لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ فسادات کی نوعیت ہی الگ ہوتی ہے۔ کیا تم نے کبھی سنا کہ کسی سیاسی لیڈر کا گھر اُجڑا ہو، کسی پولس والے کی اولاد ماری گئی ہو۔ میں تو کہوں گا کہ یہاں کی دس فیصد لومڑی جیسی آبادی نوّے فیصد خرگوش جیسی عوام کو کھا رہی ہے۔" صفدر بولتا رہا اور جیکسن سر ہلانے کے ساتھ کچھ کچھ لکھتا بھی رہا۔

اگلے دن کا سورج بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا کبھی دھوپ کبھی چھاؤں ہو جاتی۔ مکھرجی سویرے اُٹھ کر دودھ اور اخبار لینے چلا گیا۔ ہاشم رات دیر تک جاگنے کے سبب ابھی تک سو رہا تھا۔

"ہاشم، ہاشم ...... غضب ہو گیا یار اپنا صفدر اپنا صفدر۔" مکھرجی ہانپ رہا تھا شاید بھاگتا ہوا آیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور بدن پسینے سے شرابور۔ ہاشم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "کیا ہوا؟" "کیا ہوا؟" وہ بے حد گھبرا گیا۔ مکھرجی نے اخبار اس کے آگے کر دیا۔ شہ سُرخی کہہ رہی تھی کہ

"بس نمبر AC 225 منوہر ٹرانسپورٹ گنگا برج سے نیچے جا گری۔ باون افراد ہلاک۔ کچھ کی پہچان کر لی گئی ہے۔"

(۱) شیام ملہوترہ (۲) منجولا دیوی (۳) صفدر الحسن (۴) جیکسن ڈی کوسٹا

(۵) ......

ہاشم بیہوش ہو چکا تھا۔

ہاشم دو دنوں تک ان ٹنسو کیر یونٹ میں رہا۔ اس کے ماں باپ بھائی، بہن اور مہربانو کے ساتھ ساتھ مکھرجی بھی اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو گُم صم ہی رہتا۔ ٹکر ٹکر چھت کو گھورتا رہتا۔ آخر ایک ہفتے بعد اسے ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ ماں باپ اسے گاؤں

لے جانا چاہتے تھے مگر وہ کچھ بولتا ہی نہ تھا۔

اس دن مکھرجی نے اس کو اکیلا پا کر صفدر کی ان گنت باتیں یاد دلائیں اس کے خواب یاد دلائے، اس کے ارادوں کو دُہرایا، اس کا عزم یاد دلایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور دیر تک سسکتا رہا۔ جب چُپ ہوا تو ایک نیا عزم اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ اس نے مکھرجی کا ہاتھ تھاما اور بولا مجھے گاؤں جانا ہے۔ صفدر کے ادھورے خوابوں کو پورا کرنا ہے۔ میں جاؤں گا، میں ضرور جاؤں گا۔ صفدر بہت سے کام ادھورے چھوڑ گیا ہے۔ انہیں پورا کرنا ہے۔ مکھرجی نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا اور اس کا سامان پیک کرنے لگا۔

(۱۹۹۵ء)

دل ریزہ ریزہ

گرلز کالج کے گیٹ پر لڑکیاں جمع تھیں تین بج چکے تھے، کلاسیز ختم ہو چکی تھی۔ حنا اور فریحہ بھی بس کے انتظار میں تھیں۔ گرمی عروج پر تھی۔

"لگتا ہے آج بھی کالج بس دیر سے آئے گی"۔ "ہاں آثار تو یہی ہیں"۔ "تو چلو سامنے والے پیڑ کے نیچے بیٹھتے ہیں"۔ "ہاں چلو کافی ٹھنڈی چھاؤں ہے اس برگد کی"۔ حنا اور فریحہ گھنے برگد تلے بیٹھ گئیں۔

"حنا سنو! آج آتے وقت دیکھا تھا؟ بوائز ہاسٹل کے پاس کچھ ہنگامہ سا تھا"۔ فریحہ بولی۔ "ہاں تھا تو، لیکن اب تک تو ختم ہو چکا ہوگا"۔ "پر بات کیا تھی کچھ پتہ چلا؟" حنا نے پوچھا۔ "وہ ہے نا رشمی وہ بتا رہی تھی کہ دو گروپ کا جھگڑا تھا کسی نے ہاسٹل کے ایک لڑکے کو چاقو مار دیا تھا پرسوں، شاید اسی کا جھگڑا تھا"۔ فریحہ نے تفصیل بتائی۔ "اوہو آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے، کیا پڑھتے ہوں گے یہ لوگ، ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں"۔ حنا غصے اور افسوس سے ملی جلی آواز میں بولی "اچھا چھوڑو یہ باتیں فریحہ، تم نے بتایا تھا کہ سکندر کے گھر والے آنے والے ہیں، کیا تاریخ طے کرنے آ رہے ہیں!" حنا نے بات کا رخ بدلا۔ "ہاں وہ لوگ آنے والے تو تھے"۔ "کیا کہا آنے والے تھے کا کیا مطلب بھئی پروگرام کینسل ہو گیا کیا؟" حنا بیچ میں بول پڑی۔ "ارے بھئی تم بیچ میں بولوگی تو میں کیا خاک بتاؤں گی"۔

"اچھا لو اب میں خاموش ہو جاتی ہوں تم بولو۔" "بھئی ہوا یہ کہ کل شام سکندر خود ہی آئے تھے۔" "بس بس اب مجھے کچھ نہیں سننا، ذرا مجھے آواز دے لیتیں تو کیا بگڑ جاتا، بے مروت ہو تم۔" حنا ناراض ہوتے ہوئے بولی "ارے ..... رے ..... میری پیاری پیاری حنا ناراض کیوں ہوتی ہو۔ پہلے پوری بات تو سن لو، اصل میں جب وہ آئے تو امّی آنگن ہی میں بیٹھی تھیں انہوں نے وہیں کرسی لگالی، اب تم ہی بتاؤ کوئی راستہ تھا دیوار تک آنے کا؟ اگر سیڑھیوں تک بھی جا سکتی تو کام بن جاتا۔ لیکن وہ لوگ تو ایسا راستہ بند کر کے بیٹھے تھے کہ مجھے بس اپنے کمرے تک محدود ہونا پڑا۔" فریحہ نے بات ختم کی تو حنا بولی "اچھا چلو معاف کیا، لیکن بات کیا ہوئی؟" "جیسا کہ مجھے اپنے خفیہ ذریعے یعنی شازیہ سے پتہ چلا کہ سکندر کے گھر والے اب اگلے ہفتے آئیں گے، کیونکہ سکندر کی بڑی بہن اسپتال میں داخل ہیں۔" فریحہ نے اطلاع دی۔ "اے ہے خدا نہ کرے کیا ہوا انہیں؟" "ہونا کیا تھا بھئی، شادی ہوئے دو سال ہو گئے آل اولاد تو ہوگی نا بھئی بس وہی کچھ چکر ہے ویسے اب تک کوئی خوشخبری نہیں آئی ہے۔"

"ارے اٹھو اٹھو بس آ رہی ہے۔ لڑکیاں اتنا تیز دوڑتی ہیں کہ گیٹ کے باہر ہی بس کی سیٹوں پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ چلو جلدی چلو ایسا نہ ہو کہ کھڑی ہونے کی بھی جگہ نہ ملے۔" حنا نے فریحہ کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ پڑی لیکن اس چکر میں فریحہ گر پڑی اور اس کا گھٹنا چھل گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی فریحہ کی امّی کی نظر اس کے گھٹنے پر پڑی جو شلوار سمیت کٹ گیا تھا۔

"ارے فریحہ یہ کیا ہوا؟ لوتھا کی لوٹھا ہو گئیں اور بھاگم دوڑی کے کھیل نہیں گئے۔ یہ زخم کیسے لگا؟" امّی کچھ غصّے سے بولیں۔ "وہ بات یہ ہے خالہ جان کہ بس پر چڑھتے وقت ایک لڑکی نے دھکّا دے دیا۔" حنا نے بات بنائی۔

"اے ستیاناس ہو موئی کا کیسا دھکّہ دیا بچی کو ہائے ہائے۔" امّی نے ان دیکھی لڑکی کو کوسا اور فریحہ نے معصومیت سے گردن ہلائی۔ "اچھا خالہ میں جاتی ہوں، خدا حافظ، ڈیٹول لگا لینا فریحہ۔" حنا دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

ہلکے ہلکے بادلوں اور ٹھنڈی ہوا نے شام خوشگوار بنا دی تھی۔ فریحہ اور حنا کے گھر کی دوری ہی کتنی تھی اِس دروازے نکلے اور اُس دروازے گھس گئے۔ حنا نے فٹافٹ پکوڑے تلے اور فریحہ کے

گھر چلی آئی۔

"اور سناؤ بھئی تمہارے گھٹنے کا کیا حال ہے ؟" "ٹھیک ہے بھئی، ذرا سا تو چھلا تھا۔ تم نے تو بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔" فریحہ نے لاپرواہی سے سر ہلایا۔ "موسم بڑا خوشگوار ہے لو یہ پکوڑے کھاؤ اور مجھے دعائیں دو۔" حنا نے فخریہ کہا۔ فریحہ نے پکوڑا منہ میں ڈالا اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے "یا اللہ میری خالہ جان کو ایک عدد پکوڑے جیسا داماد عطا کر۔" اُس نے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی۔ "فریحہ کی بچی یہ دعا ہے یا بد دعا، لا میرے پکوڑے مجھے نہیں کرنی تجھ سے ہمدردی۔" "ارے ناراض نہ ہو، چلو دعا واپس لے لی۔" فریحہ ہنستے ہوئے بولی۔

حنا اور فریحہ بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ اور اب تو معاملہ یہ تھا کہ ایک جان دو قالب۔ دونوں کی صورت شکل میں واضح فرق تھا۔ لیکن خیالات دونوں کے یکساں تھے۔ فریحہ گوری چٹی خوبصورت لمبے قد کی تھی۔ جبکہ حنا سانولی سلونی درمیانے قد کی۔ لیکن اس معمولی تضاد نے دونوں کی دوستی میں دراڑ نہیں آنے دی تھی۔ ایک ہفتہ کیسے گذرا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اتوار کا دن تھا، حنا اور فریحہ آنگن میں میٹھی مونگ پھلیاں کھا رہی تھیں۔ دروازے کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔

"شازی او شازی ذرا دیکھنا کون ہے ؟" فریحہ نے چھوٹی بہن کو آواز دی اس بیچ گھنٹی پھر بج اُٹھی "یا اللہ! لوگ آتے ہیں تو کمبخت بیل پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی ان کے ہی انتظار میں ہو، آئے اور جھٹ دروازہ کھل گیا۔"

"سکندر بھائی آئے ہیں۔" شازیہ چلائی ..... فریحہ مونگ پھلیاں چھوڑ چھاڑ کمرے میں بھاگ گئی۔ گود میں رکھی مونگ پھلیاں آنگن میں بکھر گئیں ....

سکندر اندر آچکے تھے۔ "آداب عرض سکندر بھائی آئیے آئیے اور یہ مونگ پھلیاں چن کر کھائیے۔ آپ ہی کی محترمہ بکھیر کر گئی ہیں۔" حنا نے آتے ہی چھیڑا۔

"اخاہ! تو ہماری کوئل محترمہ بھی موجود ہیں۔ اور حسب عادت کوئی بیکار راگ الاپ رہی ہیں۔" سکندر نے جواب دیا۔ "اے ..... اے بھائی اگر مجھے کوئل کہا نہ تو تو ....." امی جان کے آجانے کی وجہ سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"آداب چچی جان !" "جیتے رہو بیٹا، خوش و خرم رہو، اللہ لمبی عمر دے، کہو بیٹا سب خیریت ہے نا"۔ "جی ہاں سب خیریت ہے، دراصل امّی نے کہلوایا ہے۔ کہ وہ لوگ کل آنا چاہ رہی ہیں"۔
"ہاں بیٹا جم جم آئیں ان کا ہی گھر ہے"۔ فریحہ کی امّی مسکرا کر بولیں۔ حنا اور شازیہ تب تک ناشتہ لے آئیں۔ فریحہ کی امّی مغرب کی نماز کے لئے اُٹھ گئیں۔ ناشتے کے دوران مذاق بھی چلتا رہا۔
"شازی! ذرا ان کی صحت تو دیکھو کھا کھا کے توند نکل آئی ہے، فریحہ ساتھ چلے گی تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھیں گے، کوئی کنکری نہ مارے اِن کے پیٹ پر"۔ حنا بولی۔
"واہ جی واہ کیا بات کہی، میرے ساتھ چلے گی تو لوگ صرف مڑ کر دیکھیں گے اور تمہارے ساتھ چلتی ہے تو فقرے بھی پھینکتے ہیں۔" حور کے ساتھ لنگور۔" وہ گنگنا کر بولے۔
"یہ جملہ ڈائرکٹ میری ذات پر ہے، سکندر بھائی شادی میں بدلہ نہ اُتارا تو پھر دیکھنا"۔ حنا چڑ ہی تو گئی۔ "ارے نہیں میری پیاری سالی محترمہ، میں تو مذاق کر رہا تھا، اچھا ایک کام تو کرنا.... ذرا رُونمائی تو کرا دو، جب سے منگنی ہوئی ہے، گھر والوں نے تو دیوار کھڑی کر دی ہے"۔ سکندر خوشامد سے بولے۔
"ہائے کیسا مسکر لگ رہا ہے، میں تو لنگور ہوں نا"۔ حنا نے نقل اُتاری۔ "اچھا لو یہ سموسہ کھاؤ"۔ سکندر نے بطور رشوت سموسہ حنا کے منہ میں دیتے ہوئے کہا۔
"جی نہیں! مجھے خالہ جان سے مار نہیں کھانی ہے۔ آپ گول ہو جائیں۔ ویسے بھی وہ اب نہیں ملے گی، غضب خدا کا شادی میں مہینہ ہی تو ہے اب کا ہے کا ملنا، بس بس بہت ہو چکا"۔ حنا نے بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کی۔ "حنا کی بچی ہاتھ مار دوں گا اُلٹی سیدھی ہانکی تو، جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، نہیں تو بارات اتنی دیر سے لاؤں گا کہ سارا میک اپ انتظار کے پسینے میں بہہ جائے گا"۔ "واہ جناب! کیا دھمکی ہے اما! بارات دیر سے لائیے گا تو رخصتی دیر سے ہوگی اور بھلا یہ آپ کو کیونکر گوارا ہوگا"۔ شازیہ نے بھی حنا کی حمایت کی۔
"اوہو تو ایسے نہیں مانو گی۔ تم لوگ، مجھے پتہ ہے وہ سامنے والا کمرہ اسی کا ہے میں تو چلا"۔ "اِدھر آپ گئے اور اُدھر ہم نے خالہ جان کو آواز لگائی"۔ حنا نے پکارنے کے انداز میں منہ کھولا۔ لیکن اُس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ شازیہ کی امّی نماز سے فارغ ہو کر ادھر ہی آ رہی تھیں۔ شازی اور حنا منہ پر ہاتھ رکھ کر

ہنسنے لگیں۔ اور سکندر انہیں اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے رہے۔

"ارے بیٹا تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں، لو یہ حلوہ کھاؤ۔" "ہاں..... ہاں سکندر بھائی لیجئے نا آپ نے تو خالہ کے انتظار میں کچھ کھایا ہی نہیں۔" حنا نے جلے پر نمک چھڑکا۔ "تم کھاؤ نہ جل ککڑی۔" سکندر نے سرگوشی کی۔ چائے سے فارغ ہو کر سکندر چلے گئے۔

دوسرا دن پیر تھا اور شام کو سکندر کے گھر والے فریحہ اور سکندر کی شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہے تھے۔ لیکن کالج جانا ضروری تھا۔ سینٹ اپ ٹسٹ ہونا تھا۔ بی۔ اے فائنل تھا اس لیے چھوڑنا بھی مشکل تھا۔ فریحہ کی امی نے بہت روکا لیکن وہ نہیں مانی اور حنا کے ساتھ کالج چلی آئی۔ راستے میں دیکھا کہ آج بھی بوائز ہاسٹل کے پاس ہنگامہ سا تھا۔ دو چار پولیس والے بھی نظر آئے۔

کالج پہنچ کر دونوں نے ٹسٹ دیا۔ واپسی پر فریحہ بولی "حنا! بھوک لگ رہی ہے۔ چلو آج کینٹین کی چاٹ کھائیں۔ پھر جانے کب نصیب ہو۔" "ارے آج تو تمہارے گھر خود ہی اتنی مزیدار ڈشز بن رہی ہوں گی"۔ حنا چٹخارہ لیتے ہوئے بولی "او، تو تمہارے خیال میں میں وہاں مسکین صورت بنانے کے بجائے مزے لے لے کر ناشتہ کروں گی۔" فریحہ نے اسے گھورا۔ باتوں میں راستے کا پتہ نہ چلا اور کینٹین بھی آ گئی۔

"او، بھائی لالہ دو چاٹ!" "بی بی چاٹ تو ختم ہو گئی، ڈوسہ ملے گا"۔ "اے ہے آج تو لگتا ہے چاٹ نصیب میں نہیں" فریحہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "ارے تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے ڈوسہ کھالو نا!" "ہُنہ مجھے نہیں کھانا مریل ڈوسہ، یوں لگتا ہے روٹی کے ساتھ آلو کی ترکاری کھا رہے ہوں، چلو اب گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔"

دونوں گیٹ سے باہر آ گئیں اور رکشہ کر لیا۔ باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ راہ چلتے مسافر، دکانیں ان میں لگی سیل موضوع بحث تھا راستہ آرام سے کٹ رہا تھا۔ اچانک رکشہ والے کو رُکنا پڑا۔

"ارے حنا وہ دیکھو، سامنے تو بس کھڑی لگتی ہے، ہائے اللہ ان لوگوں نے تو راستہ بند کر رکھا ہے۔ ہائے حنا اب کیا ہوگا۔ سچ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔" فریحہ گھبرا کر بولی۔ ڈرو مت رکشہ والا کسی گلی سے نکال لے گا..." حنا نے ڈھارس بندھائی۔ "بی بی! یہ معاملہ تو ہفتہ بھر سے چل رہا ہے، ہاسٹل

کے کسی لڑکے کو چاقو لگ گیا تھا وہ آج صبح اسپتال میں مر گیا۔ اب اس کے ساتھی انصاف مانگ رہے ہیں۔" رکشہ والے نے تفصیل بتائی۔

"کس سے انصاف مانگ رہے ہیں؟ خود ہی لڑتے ہیں پھر خود ہی نمٹا بھی لیتے ہیں۔ دکھاوے کو ہنگامہ کس بات کا۔ خواہ مخواہ پبلک کو پریشانی۔" فریحہ کی حالت غصے اور گھبراہٹ سے عجیب ہو رہی تھی۔

"تم کیوں اس قدر گھبرا رہی ہو۔ فریحہ یہ تو روز ہی ہوتا ہے۔" حنا نے سمجھایا۔ "رکشہ والے آپ دائیں گلی سے نکال لیں" "اچھا بی بی کوشش کرتا ہوں۔" "ارے یہ تو گلی بھی بند ہے۔ حنا اب کیا ہوگا؟" فریحہ رونے کو تھی۔ "چلو ایسا کرتے ہیں پیدل ہی کراس کر لیتے ہیں، دوسری طرف کوئی سواری کر لیں گے۔" انہوں نے رکشہ چھوڑ دیا۔ اور پیدل ہی بس کی طرف چل پڑیں۔ ابھی بس کے قریب بھی نہیں پہنچ پائی تھیں کہ بھگدڑ مچ گئی۔

"ارے یہ بھگدڑ کیسی، میرا ہاتھ تھام لو۔ یا اللہ رحم، دعائیں پڑھو مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے حنا! حنا!" ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے اور اگلا منظر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا...

آنکھ کھلی تو خود کو ہاسپٹل کے بیڈ پر پایا اور اطراف میں دو پولیس والوں کے ساتھ امی اور سکندر بھائی نظر آئے۔ تھوڑا اور ہوش آیا تو آس پاس کا منظر واضح ہوا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ لاکھ روکنے پر بھی نہ رُکے اور کچھ بولنا تو کجا کسی کی طرف دیکھنے کا بھی یارا نہ رہا۔

پولیس انسپکٹر نے سوالات شروع کر دئے اور حنا نے رو رو کر تمام داستان کہہ سنائی۔

"لیکن فریحہ؟ امی! فریحہ؟" حنا کا سوال چیخ سے کم نہ تھا۔ امی نے آنسوؤں کے درمیان بتایا کہ فریحہ گھر پر ہے۔ سکندر کی آنکھیں بھی لال تھیں۔ انہوں نے بمشکل اس کا حال پوچھا۔

"اگر تم بہتر محسوس کر رہی ہو تو گھر چلیں؟" حنا کا سر اور ہاتھ پٹیوں میں جکڑے تھے۔ کپڑے خون سے داغدار، اب تو ان کا رنگ بھی کالا ہو چکا تھا۔ انسپکٹر جا چکا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس پاس ہی کھڑے تھے ماحول بڑا بوجھل تھا۔ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ ڈاکٹر سے اجازت لے کر وہ لوگ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹیکسی گھر کے دروازے پر رُکی تو فریحہ کے گھر غیر معمولی مجمع کو دیکھ کر حنا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اندیشے اور وسوسوں نے اُسے گھیر لیا۔ "چلو بیٹی حنا، میرا ہاتھ تھام لو، اللہ کی مرضی میں کسے دخل۔"

دونوں فریحہ کے گھر میں داخل ہوئیں .... حنا کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ کسی انہونی کے احساس نے اس کا کلیجہ دہلا دیا تھا۔ سکندر جو ٹیکسی سے اُتر کر غائب ہو گئے تھے دروازے پر ہی مل گئے۔ " فریحہ ٹھیک تو ہے نا سکندر بھائی آپ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں ؟" حنا کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔ گہرا سناٹا تھا۔ گاہے بگاہے سسکیوں کی آواز آتی تھی، کافور کی مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

" تم خود ہی دیکھ لو، تمہاری فریحہ بہت آرام سے ہے' ابھی تو وہ سو رہی ہے آرام کی نیند گہری نیند " سکندر کی آواز گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔ حنا کمرے میں داخل ہو چکی تھی، اندر کا منظر حنا کے ہوش گُم کرنے کے لئے کافی تھا۔ فریحہ آخری سفر کے لئے تیار تھی' سفید کفن میں لپٹا معصوم چہرہ نور برسا رہا تھا۔

اور بس! حنا کی سوچ سلب ہو چکی تھی۔ لمبی بے ہوشی نے اُسے تمام احساسات سے بَری کر دیا۔

(۱۹۹۰ء)

گردشِ ایّام

"السّلام علیکم..... بڑے ابّا!"

"آہا! اچھّن میاں اور دلہن ہیں، آئیے آئیے..... جیتے رہئے۔ بھئی بہت دنوں پر آئے۔" خان صاحب نے نوواردوں کو گلے سے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود اپنی کالے بید کی آرام دہ کرسی پر براجمان ہو گئے جو آگے پیچھے دولتی تھی۔

"موقع سے فائدہ اٹھانا تو کوئی آپ کی پارٹی سے سیکھے اچھّن میاں۔"

"گستاخی معاف بڑے ابّا۔ اس بار الکشن میں آپ کی پارٹی کے تو چھکّے چھوٹ گئے۔"

"ارے میاں چھکّے تو چھوٹنے ہی تھے۔ آپسی چپقلش سے باز نہ آئے تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہم نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ پارٹی لیڈرشپ کا جھگڑا انہیں لے ڈوبے گا اور وہی ہوا۔"

اچھّن میاں کھدّر پوش نوسیاستئے تھے اور اپنے بڑے ابّا کی مخالف پارٹی میں شامل تھے۔ مگر بہت لاڈلے۔ اس لئے ایسی نوک جھونک ان دونوں میں اکثر ہوا کرتی تھی۔ اچھّن میاں کی دلہن نے سیاست چھڑتی دیکھی تو کچن کی طرف چلی گئیں جہاں خان صاحب کی چھوٹی بہو چائے ناشتے کا انتظام کر رہی تھیں۔ "ارے افروز یہاں کہاں چلی آئیں۔" انہوں نے اسٹول آگے کرتے ہوئے کہا۔

" وہاں تو پارٹی پالیٹکس شروع ہوگئی ہے میں بھلا کہاں فٹ ہوتی اس میں۔ گھر میں بھی ان کے دوست احباب مل کر یہی کچھ تو کرتے رہتے ہیں، یہاں جلسہ وہاں جلوس' اِدھر دھرنا اُدھر گھیراؤ' میں تو بھر پائی۔"

" دراصل سیاست ابا کی کمزوری ہے خود تو کبھی الیکشن لڑے نہیں اوروں کو لڑواتے رہے اور گھر بیٹھے منتری ایم ایل اے بنواتے رہے۔ اب جہاں کوئی مل بیٹھتا ہے تو سیاست ضرور زیر بحث آتی ہے۔ عمر کا تقاضہ ہے نا باہر آنا جانا کم ہوتا ہے۔"

" لیکن کرنٹ نالج رکھتے ہیں بڑے ابا۔"

" کیوں نہ ہو بغل میں باوا آدم کے زمانے کا ریڈیو جو رکھا ہے۔ ساری دنیا کی خبریں سن لو تم ان سے' کہاں کیا ہو رہا ہے کس لیڈر کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، کس کی حکومت کا تختہ پلٹنے والا ہے۔ کہاں کہاں مسلمان مارے جارہے ہیں' ابا سوائے خبروں کے کچھ سنتے کہاں ہیں۔ ٹی وی سے انہیں شغف نہیں بس یہ ریڈیو ان کی جان ہے سمجھو! بڑے بھیا نے کینیڈا سے اتنا خوبصورت ریڈیو بھیجا ہے مگر ویسے ہی پیک رکھا ہے۔ اِس کا تو یہ حال ہے کہ ذرا سا بگڑا اور لگائی ابا نے ایک چپت' پھر بجنے لگا۔"

" تم سناؤ امّی کے یہاں سب خیریت ہے نا۔"

" ہاں سب ٹھیک ہے' پتہ ہے آپا! خالہ جان نے صنوبر کے رشتے کے لئے ہاں کہدی ہے ہم جلد ہی منگنی کے لئے جائیں گے۔"

" اچھا یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی تم نے، بہت بہت مبارک ہو۔ مگر اچھن میاں تو خلاف تھے اس کے؟"

" انہیں بس ایک ہی بات پر اعتراض تھا کہ بارات خالہ جان کے گھر جائے نہ کہ ماموں کے گھر آپ تو جانتی ہیں صنوبر کو ماموں جان نے پالا ہے اور وہ اس کی شادی اپنے گھر سے کرنا چاہ رہے تھے۔ ہم سب نے سمجھایا تو یہ مان گئے۔ ماموں لاولد ہیں نا۔"

" دلہن ...... چائے وائے لائیے بھئی۔" خان صاحب نے پکارا۔ " چلو افروز میں چائے لے کر آرہی ہوں۔ امی نے نماز پڑھ لی ہوگی تم وہیں بیٹھو' ناہید بھی بس آتی ہی ہوگی'، بچوں

کے ساتھ پڑوس میں سالگرہ تقریب میں گئی ہے۔"

اُدھر چچا بھتیجے میں بحث جاری تھی۔ خان صاحب نے کہا۔

"تمہارے رام پرساد نے تو خوب دھاندلی کی میں ہوتا تو قسم خدا کی کیس کر دیتا۔" "نہیں نہیں بڑے ابا رام پرساد جی تو بڑے پاپولر لیڈر ہیں۔" "رہنے دو میاں ہمیں سب معلوم ہے پچھلی بار اپنے حلقے کے دورے پر نکلے تو ان کے ووٹرز کالے بیج لگائے رام پرساد ہائے ہائے کے نعرے لگا رہے تھے۔"

"مخالف پارٹی کی سازش تھی بڑے ابا یہ عقدہ تو بعد میں کھلا، سب کے سب کرائے کے تھے۔"

"لیجئے۔ چائے آگئی۔ بسم اللہ کیجئے۔" انہوں نے اگالدان اٹھا کر پیک پھینکی اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "دلہن! ابھی وہ چنے کا حلوہ کھلائیے اچھن میاں کو، جو ہماری سمدھن نے بنا کر بھیجا ہے، اور افروز بٹیا کو بھی بلائیے۔"

"ابھی لائی ابا جان۔ آپ کے لئے بھی لاؤں ؟"

"نہیں رہنے دیجئے ہم صرف چائے لیں گے۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی انہوں نے اپنے خاص ملازم کو جسے وہ کم قد کی وجہ سے بالشتیہ کہتے تھے، دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔

"السلام علیکم ......"

"ارے .... نہال بیٹا موقعے سے آئے بھئی آئیے شروع ہو جائیے۔ باتیں بعد میں۔"

"خالو ابا یہ بطورِ خاص آپ کے لئے۔" نہال نے خوبصورت سی چھڑی ان کے حوالے کی۔

"اچھا ہوا اچھن بھیا اور بھابھی جان سے ملاقات ہو گئی۔ حیدر آباد جانے سے قبل مل ہی نہ سکا تھا۔"

"ہاں تم جب چلے گئے تو معلوم ہوا کہ دارالنگل پوسٹنگ ہوئی ہے۔"

"جی بھیا بڑی خوبصورت جگہ ہے۔"

"نہال میاں یہ بتائیے کہ فضل الحق سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔"

"خالو ابا۔ کیا بتائیں وہ تو آپ کا نام سن کر کھڑے ہو گئے۔ بڑے تپاک سے ملے اور ڈھیروں باتیں

کیں ۔ کہنے لگے بطورِ خاص آپ سے ملنے بہار آئیں گے ۔"

"ہاں ..... یہ ہوئی نا، کام کی بات ۔ برسوں بیت گئے، ہم علی گڈھ میں چھ سال ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں رہے ۔ پھر اس نے کمپیٹیٹو اگزام پاس کیا اور افسر ہو گیا ۔ اور ہم اجداد کی جائداد سنبھالنے کے لئے واپس بلا لئے گئے ۔"

چائے کا دَور چل چکا تھا ۔ "اب اجازت دیں بڑے ابا" ۔ اچھن میاں اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

"آتے رہئے گا ..... مانا کہ آپ برسرِ اقتدار پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں مگر ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ والی کہاوت سنی ہے نا آپ نے ؟" "ابھی جلدی میں ہوں بڑے ابا ورنہ ثابت کر دیتا کہ مرے ہوئے ہاتھی کی قیمت گر گئی ہے ۔" اچھن میاں نے ہنستے ہوئے کہا تو خان صاحب کے ساتھ ساتھ سبھوں کا قہقہہ گونج اُٹھا ۔ ننھیال بھی جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو خان صاحب نے کہا "اپنی خالہ امّی سے جا کر مل لیجیے، انہیں بڑا قلق ہے آپ کے اتنے دور چلے جانے کا ۔"

نصر اللہ خاں پُرانی قدروں کے امین مگر دمہ کے دائمی مریض تھے لیکن خوب سے خوب تر سگریٹ کے شوقین تھے، چاپ داڑھی، کانوں سے نیچے تک کھچڑی بال مگر چاندی پر سے فارغ البال، موٹی موٹی غلافی آنکھیں، بارعب آواز، تنومند، لمبے قد کاٹھ کے تھے ۔ اکثر کھادی کا کرتہ اور پائجامہ زیبِ تن رہتا، چلتے وقت ہاتھ میں چھڑی رہتی جسے وہ وقفے وقفے سے گھماتے رہتے ۔ شطرنج کے منجھے ہوئے کھلاڑی اور خاندانی رئیس تھے ۔ دو لڑکے جمال اور بلال، دو لڑکیاں صبیحہ اور ناہید تھیں ۔ بڑا بیٹا بہو اور بچے کینیڈا میں بس گئے تھے ۔ چھوٹا مقامی بنک میں افسر تھا ۔ ایک بیٹی کی شادی اپنے ایک دوست کے لڑکے سے کی تھی جو سعودیہ میں ڈاکٹر تھا اور دوسری کی منگنی کر چکے تھے ۔ سیاست پر گفتگو کرنا ان کی کمزوری ہے یہ سب ہی جانتے تھے ۔ ایک لڑکا نما خادم ہمیشہ ساتھ رہتا جو صرف ان کے تصرّف میں رہتا ۔ خرچیلے بھی بے حد تھے ۔ کئی مہنگے شوق پال رکھے تھے ۔ مگر غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنا ان کے نزدیک جنت میں گھر بنانے جیسا تھا ۔ کئی رکشہ والے، مزدور ان کے پرانے گیراج میں ڈیرہ ڈالے تھے ۔ گھر سے نکلتے تو جانے کتنے ہاتھ سلام کے لئے اُٹھتے ۔ کتنی ہی دعائیں ان کی صحت و سلامتی کی عرش تک جاتیں ۔ غرض کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق زندگی گذار رہے تھے ۔ بڑے بیٹے کی شدید خواہش

تھی کہ وہ کینیڈا میں سیٹل ہو جائیں مگر خان صاحب ہر بار ٹال دیا کرتے ۔ مگر کب تک ۔ چھوٹی بیٹی کا منگیتر گرچہ تھا تو جمال کا سالا مگر اس نے شادی کے لئے گرین کارڈ کی شرط رکھ دی تھی جسے پورا کرنے کے لئے انہیں ایک نہ ایک دن کینیڈا چلے ہی جانا تھا کیونکہ وہ ہرگز رشتہ توڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ معاملہ کچھ دن اور ٹل جاتا ۔ مگر جب سے اس کی پارٹی الیکشن میں ہاری تھی ۔ انہوں نے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا ۔ قلق تو اس بات کا تھا کہ ان کا اپنا خون بلال ان کی مخالف پارٹی کا حامی تھا ۔

الکشن کے دنوں تو کئی کئی گھنٹے بحث چلی ۔ بلال کے اپنے دلائل ہوا کرتے ۔ خان صاحب اپنی بات پر اڑے رہتے ۔ ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ مرزا سلیم بیگ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تو اچھن میاں اور ان کے والد بلال کے حمایتی بن جاتے ۔ بحث میں گرمی آنے لگتی تو بلال اُٹھ جاتے مبادا ان کا رویہ خلاف تہذیب نہ ہو جائے ۔ صبح اور رات کا وقت بچّوں کے لئے وقف ہوتا ۔ آج کل ان کی بڑی لڑکی اپنے بچّوں کے ہمراہ چھٹیاں گذارنے آئی ہوئی تھی گویا نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں سے گھر میں خوب رونق رہتی ۔ بچّے اُنہیں شروع سے ہی بے حد پسند تھے ان کے خیال میں وہ رحمت کے فرشتے ہوتے ہیں ۔ رات جب سب ان کے بستر پر براجمان ہوتے تو وہ طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتے جس میں زیادہ تر ان کے اپنے بچپن کے قصّے ہوتے ۔ علی الصباح خود بھی اُٹھ جاتے اور بچّوں کو بھی اٹھا دیتے ۔ کلام پاک کی تلاوت کے بعد بادام اور کشمش کی تقسیم ہوتی جس کا حصول بچّوں کو پابندی سے صبح اُٹھ کر تلاوت کی ترغیب دیتا ۔ کبھی کبھی سب کو بازار لے جاکر فرمائشی چیزیں بھی دلایا کرتے اس لئے ان کا حکم سر آنکھوں پر رہتا ۔

ہولی کی چھٹیاں تھیں بلال گھر پہ تھے ۔ اچھن اور ان کے دوست بھی آجاتے تو لمبی بیٹھکیں ہوتیں ۔ ایسے میں خان صاحب اور سلیم بیگ شطرنج کی بساط بچھا لیتے اور گھنٹوں مصروف رہتے ۔ حال ہی میں انہوں نے ماربل چیس بورڈ (Marble chess board) جبل پور سے منگوایا تھا اس لئے بازیوں کی گنتی بھی نہ ہوتی ۔ مگر اس دن گھڑنت ہو ہی گئی جب برسرِ اقتدار پارٹی کی قصیدہ خوانی خان صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے سب کو اپنے کمرے میں بلالیا ۔

"میاں برساتی جنگل جھاڑ کیا مقابلہ کرے گا ہمارا ! ارے بھئی ! ہماری پارٹی پاور میں تھی تو کیا پڑھا لکھا طبقہ یوں ذلیل و خوار تھا۔ تمہاری پارٹی میں تو جاہلوں کی کثرت ہے۔ ہم نے اپنے زمانے میں اساتذہ کو جو مرتبہ دیا اور دلوایا اسے کوئی بھول سکتا ہے۔ تنخواہوں میں اضافے، فلاحی منصوبوں کا نفاذ، غریبوں کے لئے روزی روٹی، بے روزگاروں کے لئے روزگار کیا نہیں کیا میاں۔"

اب اچھن میاں کی باری تھی۔ "بڑے ابا میں مانتا ہوں، مگر یہ بھی سچ ہے کہ مسلسل پاور میں رہنے سے ان کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا تھا اور لیڈران خود کو بادشاہ سلامت جیسی مخلوق سمجھنے لگے تھے۔"

"جی ہاں ابا .... اس کی چھوٹی سی مثال ہی لیجئے نا۔ آپ کو یاد ہوگا پچھلے سال اگست میں بینک کے کام سے میں دلی گیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اسٹیشن پر سمیع الدین کاکا سے ملاقات ہوگئی ان کا لڑکا "کوما" میں تھا اور ایمس (AIIMS) والے اسے ایڈمٹ نہیں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی ایم پی سے لکھوا کر لائیے۔ بیچارے ناکام و مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے میں نے انہیں روکا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے حلقے کے ایم پی دلی میں ہی تھے میں نے آپ کے تعلقات کے بھروسے کاکا کو روک لیا۔ ان کے لڑکے کی حالت ایسی تھی کہ اسی وقت ساتھ لے کر ان کے یہاں پہنچا حالانکہ وہ مجھے پہچانتے تھے مگر انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور مدعا بیان کرنے پر تو جھٹ سے ہی اکھڑ گئے۔ فرمانے لگے آپ لوگوں نے مجھے میونسپلٹی کا لیڈر سمجھ رکھا ہے۔ کل کو کہئے گا نل میں پانی نہیں آرہا ہے پانی چاہئے بجلی کا تار ٹوٹ گیا ہے بجلی چاہئے۔ اتنا سن کر میں نے آپ کا حوالہ دینا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے سیدھا نوین بابو کے یہاں پہنچا۔ آپ یقین کیجئے ابا، آدھے گھنٹے میں نہ صرف مریض ایڈمٹ ہو گیا بلکہ خصوصی توجہ دی جانے لگی۔" بلال خاموش ہوا تو خالد نے کہا۔ "اب آپ ہی بتائیے بڑے ابا ہم کیوں نہ بدظن ہوں۔"

"بھئی اتنا تو مانتے ہو نا وہ جینئس ہے اور ایسے لوگ تھوڑے سرپھرے ہوتے ہیں بیٹا۔" خان صاحب نے بجھا ہوا سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ اچھن میاں کب خاموش رہنے والے تھے۔ بول پڑے "ان کی ذہانت سے عام لوگوں کو کیا فائدہ ووٹر تو ان کے سمیع الدین کاکا جیسے لوگ ہی ہیں نا بڑے ابا۔"

اب سلیم بیگ کی مداخلت ضروری تھی۔

"کہاں اُلجھ گئے' شطرنج کی بازی ادھوری چھوڑ کر۔ مان لو کہ ہمارے بوڑھے کاندھے اب پارٹی کا بوجھ نہیں سہار سکتے پارٹی کو اِن نوجوان کاندھوں کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے پارٹی لیڈرز کے سروں میں کُلبلاتے کیڑوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اب وہ زمانے لد گئے بھائی جب تمہارے جیسے لوگ کھادی کا کرتا پائجامہ ہی نہیں کھادی کی بنیان بھی پہنا کرتے تھے۔" مرزا صاحب کی بات پوری ہوئی تو خان صاحب نے انہیں شاکی نظروں سے دیکھا اور بولے "مرزا تم بھی!" اور یہ شعر گنگنانے لگے:

سعدیا شیرازیا پند مدہ کم ظرف را
کم ظرف اگر بزرگ شود تہمت دہد استاد را

نشست جاری رہی مگر ان کا دل نہ شطرنج میں لگا اور نہ ہی انہیں چائے اچھی لگی۔ نہ انہوں نے ریڈیو سنا اور نہ ہی بچوں کو کہانیاں سُنائیں۔ سوچ کے سمندر میں ایسے ڈوبے کر آخری فیصلہ کر کے ہی اُبھرے۔

خان صاحب کے اچانک کینیڈا شفٹ ہونے کے متعلق خبر سن کر سب ہی ششدر رہ گئے۔ دبے لفظوں میں سب نے منانے کی کوشش کی مگر ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب وہ بیوی اور بیٹی کے ہمراہ ہمیشہ کے لئے وطن چھوڑ رہے تھے۔ اپنے زیرِ سایہ رہنے والوں کی پریشانی کے متعلق سوچ کر وہ ٹھٹکے مگر بلال نے فرمانبرداری کا ثبوت یوں دیا کہ خود کو ان کی سرپرستی کے لئے پیش کر دیا۔ بچوں کی معصوم نگاہیں بھی انہیں نہ روک سکیں۔ لاتعداد آنکھیں اشکبار تھیں۔

شطرنج کی آخری بساط بچھاتے وقت مرزا سلیم بیگ سے رہا نہ گیا۔ "چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے بددل نہیں ہونا چاہئے' اتنا بڑا فیصلہ کر لیا' پتہ ہے نا پھر چھ مہینے بعد ہی آسکو گے۔"

"بات رنجش کی نہیں ہے مرزا' ناہید کا مسئلہ بھی تو ہے"۔ "اس کا کوئی دوسرا حل بھی تو نکل سکتا تھا۔" "مگر جمال اور اس کے بچوں کا بھی تو حق ہے نا مجھ پر تم ہی بتاؤ پندرہ سال کم تو نہیں ہوتے۔"

"بچے بہت چھوٹے تھے جب جمال کینیڈا گیا تھا۔ بیچ میں بس ناہید اور بلال کی شادی پر آئے تھے وہ لوگ' ناہید کی ماں بھی یہی چاہتی ہیں۔"

"لیکن یار انجان جگہ ہوگی اور اجنبی لوگ، تم جی سکو گے ایک بار پھر سوچ لو۔"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے مرزا۔" انہوں نے بات ختم کرتے ہی بساط بند کر دی اور بازی ادھوری چھوڑ دی۔

ایرپورٹ روانہ ہوتے وقت انہوں نے چہرے سے اپنی اندرونی کیفیت ظاہر نہ ہونے دی اور ہمیشہ کی طرح زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ مگر وطنِ عزیز کو الوداع کہتے وقت وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور سب کی نظر بچا دو مٹھی مٹی اپنے چشمے کے خول میں رکھ لی۔ جہاز اڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے نقطے میں تبدیل ہو گیا۔

انجان سرزمین پر قدم رکھتے ہی انہیں اپنے اندر کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوا۔ دسمبر کے اواخر کی سردی تھی اور چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ سفید برف جس نے ہر چیز کو ڈھک رکھا تھا۔ رگوں میں دوڑتے خون اور آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں تک کو منجمد کر دینے والی برف سے انھیں انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ وہ یونہی خیالوں میں گم تھے۔ جمال کی آواز نے ان کی محویت کو توڑا۔

"ابّو سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی" جمال نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بیٹا، تمام مرحلے بخیر و خوبی انجام پاگئے۔"

"امّی آپ کے ذوق کی خواتین بھی ہیں یہاں۔ دو چار دن میں ان سے متعارف ہو جائیے گا تو بوریت نہیں ہوگی۔"

"جی ہاں امی سال میں دو بار ہم ہینڈی کرافٹس کی ایکزی بیشن بھی لگاتے ہیں۔" بہو نے مداخلت کی۔

"ناہید تمہارے لئے میں نے کمپیوٹر کورس کا ایڈمیشن فارم بھر رکھا ہے۔"

"بیٹا، یہاں برف باری بہت ہوتی ہے کیا؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں ابّو جان! سردیاں عروج پر ہیں نا، اس لئے ابھی چھ مہینے تک ایسا ہی موسم رہے گا۔" جمال نے جواب دیا۔

"برف باری کا تو یہ عالم ہے کہ میّت ہو جائے تو اسی برف میں دفن کر دیتے ہیں۔ گرمیوں میں قبر

نصیب ہوتی ہے۔"

بہو نے بہت نارمل انداز میں بتایا مگر خان صاحب لرز گئے۔

چار گھنٹے کے سفر کے بعد ایر پورٹ سے گھر پہنچے تو بچے منتظر ملے۔ انہوں نے بچوں کو گلے لگایا، پیار کیا مگر ایسا محسوس ہوا جیسے برف نے پیچھا نہیں چھوڑا ہو۔ خان صاحب کی بہ نسبت ناہید اور اس کی ماں بے حد خوش تھیں۔ ان کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایک بات تو ان کے لئے بھی اطمینان بخش تھی کہ اب ناہید اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ خان صاحب بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گرچہ کھانا کھا کر بستر پر دراز ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے، ان کی بازگشت کے دائرے میں وہ خود کو مقید محسوس کر رہے تھے۔ پھر جانے کب آنکھ لگی۔ کسی نے انہیں اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ صبح دیر سے اُٹھے کمرے سے باہر نکلے تو دیوار پر لگی سیاہ شیٹ پر نظر پڑی جس پر چند عبارتیں تحریر تھیں۔ قریب آئے اور پڑھنے لگے۔ لکھا تھا "دو دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں۔" ہبیب۔

یہ ان کا پوتا حبیب جمال تھا جو یہاں ہبیب کہلاتا تھا۔

"موم، رات کے کھانے پر انتظار نہ کرنا" — زین

یہ تھی ان کی پوتی زینت فاطمہ۔ جسے یہاں سب زین کہتے تھے۔

"آفس کے بعد میں اور ناہید شاپنگ کے لئے چلے جائیں گے۔ اس لئے دیر سے لوٹیں گے۔" ڈولی

یہ ان کی بہو دلشاد تھی۔

"ابو میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" جمال

خان صاحب کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ انہوں نے بیگم کو آواز دینا چاہی، جو کچن میں تھیں۔ مگر وہ اب کیا سنتیں۔ جبکہ ساری زندگی صرف ان کے بچوں کی ماں بن کر رہی تھیں۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث دلوں کے بیچ فاصلے پیدا ہو چکے تھے۔ انہیں لگا برف باہر ہی نہیں اندر بھی ہے اور وہ تازہ میت کی طرح برف میں دفن کر دئے گئے ہوں۔

(۱۹۹۵ء)

پس نوشت

پروفیسر وہاب اشرفی - چیرمین بہار اسٹیٹ یونیورسیٹی سروس کمیشن پٹنہ

دنیائے افسانہ میں تسنیم کوثر نووارد ہیں' لیکن گذشتہ پانچ برس سے انھوں نے اِس صنف میں اپنی تخلیقی قوت کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ افسانہ نگاروں کی کثیر تعداد اکثر نئے چہروں کی شناخت میں سخت رخنہ بنتی ہے لیکن اِس میں کچھ استثنائی صورت بھی ہے۔ ایسا ہی کچھ تسنیم کوثر صاحبہ کے ساتھ بھی ہوا ہے' وہ پہچانی جارہی ہیں اور بہت تیزی سے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ آج کا اُردو افسانہ مسائل سے جھوجھ رہا ہے' نیا افسانہ نگار اپنی اولین کوششوں میں رومان کی راہ پر بھٹکتا رہتا ہے۔ سطحیت اور جذباتیت کا شکار ہوتا ہے اور من مانی پُرکشش دُنیا آباد کرکے خوش ہوتا ہے۔ لیکن زمانے کے نئے چیلنج نے نئے افسانہ نگاروں کو زیادہ حساس بنادیا ہے' اُسے اب حالات سے نبرد آزما ہونا ہی ہے' تسنیم کوثر اِس باب میں کچھ زیادہ ہی حساس اور باشعور ہیں۔ وہ اپنے اِرد گرد کے ماحول پر نظر ڈالتی ہیں' سماجی ناہمواریوں کو محسوس کرتی ہیں' سیاسی بازیگیری پر نظر رکھتی ہیں اور پھر انھیں موضوعات کے طور پر دیکھتی ہیں تب اُن کا افسانہ تخلیق ہوتا ہے' یہ بڑی اہم بات ہے اور اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

تسنیم کوثر زبان کے معاملے میں بھی خاصی حساس ہیں' اُن کی تخلیقی زبان شگفتہ اور پُرکشش ہے جس سے اُن کے افسانے اور بھی لطیف بن گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے افسانوں کا مجموعہ " بونسائی " ادبی حلقے میں خاصے کی چیز ہوگا جس کی ہر سطح پر پذیرائی ہوگی۔

وہاب اشرفی
۵/۱۱/۹۵

جناب شفیع مشہدی - ممبر بہار پبلک سروس کمیشن - پٹنہ

تسنیم کوثر افسانہ نگار ہیں اور بہت اچھی افسانہ نگار۔ اِن کے افسانوں میں عصری حسّیت، سماجی شعور اور دردمندی کے احساسات نمایاں ہیں۔ موضوعات کا تنوع، مشاہدات کی گہرائی اور کردار کے ساتھ ان کا دردمندانہ سلوک ان کے افسانوں

کا خاصہ ہے۔ اِن کی کردار نگاری میں مخصوص "اپنائیت" ہوتی ہے جو تخلیق سے خالق کے گہرے رشتے کی نشاندھی کرتی ہے۔ دلکش طرزِ تحریر اور فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ کہانی پر اِن کی مضبوط گرفت نے بہت جلد اِنہیں اُردو میں اور بالخصوص اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت دیدی ہے۔ اِن سے ادب اور خصوصًا افسانوی ادب کی بہت ساری اُمیدیں وابستہ ہیں۔

9/11/95

ڈاکٹر شمشاد حُسین، پروفیسر آف سائیکولوجی، ڈائرکٹر کورسپونڈنس کورسز پٹنہ یونیورسیٹی پٹنہ

تسنیم کوثر اور اُن کے شوہر، انوار الحق تبسّم، جو میرے شاگرد بھی ہیں، مجھے اپنوں کی طرح عزیز رہے ہیں۔ ان دونوں کے سبھاؤ اور برتاؤ اور علم و ادب سے ان کی گہری دلچسپی کو میں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ تسنیم کوثر اُردو اور ھندی دونوں زبانوں میں کہانیاں لکھتی ہیں۔
میں نے ان کی بیشتر کہانیاں پڑھی ہیں، جن میں زندگی کی مایوسیوں، محرومیوں اور تلخیوں نیز انسانی ذھن کی کشمکش کی جس فنکارانہ انداز میں عکاسی ملتی ہے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ہوں۔

ان کی کہانیاں نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی اھمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کرداروں میں انسانی نفسیات کا گہرا مُطالعہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں "آنو کھا رشتہ"، "قیدِ حیات" (جو "آب" بونسائی" کے عنوان سے اِس کتاب میں شامل ہے اور مجموعے کا نام بھی اسی سے مأخوذ ہے) "لوٹ پیچھے کی طرف"، "مہاجر"، "اُجالوں کے نئے سفیر" اور "گردشِ ایّام" وغیرہ ہیں جو نفسیات کے طالبعلموں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ واضح رھے کہ اوّل الذکر دونوں کہانیوں کے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

تسنیم کوثر ایک جینوئن تخلیقی فنکار ھیں اور ان کے افسانوں کی زبان کوثر و تسنیم سے دُھلی رواں دواں ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ان کا یہ افسانوی مجموعہ "بونسائی" علمی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور افسانہ نگاری کی دُنیا میں اُن کی ایک الگ شناخت قائم ہوگی۔

شمشاد حسین

ڈاکٹر عبدالصمد - چیرمین، اُردو ایڈوائزری بورڈ، حکومت بہار، پٹنہ

تسنیم کوثر کے انسانوں کی جو خصوصیت ہے اور جو مجھے خاص طور سے متاثر کرتی ہے، وہ ہے اُن کا زمین سے گہرا رشتہ۔ وہ ہوائی قلعے تعمیر نہیں کرتیں اور نہ احمقوں کی جنت میں رہتی ہیں۔ اُن کی نگاہیں اُن مسائل پر پڑتی ہیں جو ہمارے آس پاس نہ صرف پھیلی ہوئی ہیں بلکہ ہمیں جکڑے رہتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ واضح تصویر ہوتے ہوئے بھی ہم اُنھیں دیکھ نہیں پاتے۔ تسنیم کوثر کے افسانوں میں سماجی شعور بدرجہ اَتم موجود ہے۔ وہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس اُبھرنے والے افسانہ نگاروں کی بالکل نئی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور سفر کے پہلے پڑاؤ پر اس قدر باوقار ٹھہراؤ ان کے روشن مستقبل کی دلیل ہے.....

عبدالصمد

جناب رضوان احمد - مدیر اعلیٰ، روزنامہ عظیم آباد اکسپریس۔ پٹنہ

تسنیم کوثر کو کہانی کہنے کا آرٹ آتا ہے۔ وہ قصّہ گو ہیں اور قصّہ گوئی کے لوازمات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی لئے قاری انکی کہانی شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دَم لیتا ہے ـــــ ختم ہونے پر بھی انکی کہانی ختم کہاں ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو فکر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ یہی ان کی کہانی کی خوبی ہے جو قاری کے سامنے بہت سے سوالات چھوڑ جاتی ہے۔ فکر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پہروں تک غلطاں و پیچاں رکھتی ہے۔

تسنیم کوثر کی کہانیوں میں نیا پن ہے انفرادیت ہے اور عصری حسّیت بھی۔ ان کا اسلوب روایتی ہوتے ہوئے بھی دلپذیر ہے جو قصّے کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے، اُن کی کہانیوں میں عصرِ حاضر کا کرب شدّت سے دَر آیا ہے۔ معاشرے پر طنز کرتے ہوئے نہ وہ جذباتی ہوتی ہیں اور نہ غیر محتاط، نہ ہی کہانی کے حسن کو مجروح ہونے دیتی ہیں۔ اختصار اُن کی کہانی کا ایک اور وصف ہے جو اسے زیادہ کاٹ دار بنا دیتا ہے۔ بقول شخصے

؎ کہانی اتنی دلکش ہوگی جتنی مختصر ہوگی

رضوان احمد

جناب امتیاز احمد - ریڈر پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف ھسٹری پٹنہ یونیورسیٹی، پٹنہ

اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں تسنیم کوثر ایک اُبھرتا ھوا نام ھے۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کی عام زندگی کی پُرکشش اور موثر عکاسی ھوتی ھے۔ انسانی جذبات کی سچائی اور انسانی رشتوں کے خلوص کے ساتھ انداز بیان کی شائستگی نے ان کے طرز تحریر کو ایک منفرد خصوصیت بخشی ھے۔

امتیاز احمد

ڈاکٹر محمد غفار صدیقی - ریڈر، پوسٹ گریجویٹ، ڈیپارٹمنٹ آف پرشین پٹنہ یونیورسیٹی پٹنہ

پچھلے پانچ - چھ سال کی مختصر مدت میں اپنی ذھانت اور مستقل مزاجی سے تسنیم کوثر کئی محاذ پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ھوئی ھیں ان میں افسانہ نویسی بھی ھے۔ وہ Issues پر لکھتی ھیں اور ڈوب کر لکھتی ھیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات میں تنوع ملتا ھے، مشاھدے کی گہرائی ملتی ھے اور کرداروں کے ساتھ ھمدردانہ برتاؤ بھی۔ زبان پر قدرت رکھنے کے باوجود وہ انشا پردازی نہیں کرتیں بلکہ زبان کا تخلیقی استعمال کرتی ھیں۔

آج کا اُردو افسانہ جہاں دیہاتوں میں رھنے والے اسّی فیصد سیدھے سادے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے دامن بچانے کی کوشش کر رھا ھے۔ تسنیم کوثر ان بھولے بھالے معصوم لوگوں کی زندگی اور درپیش مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ھیں۔ ایسی کہانیوں میں "ملیچھ" "ادھورے خواب"، "انوکھا رشتہ" اور "دو نینن" قابلِ ذکر ھیں، جن میں دیہی زندگی کی عکاسی ھی نہیں نقاشی ملتی ھے۔ یہاں وہ اپنا رشتہ پریم چند اور پھنیشور ناتھ رینو جیسے عظیم نگاروں سے جوڑتی نظر آتی ھیں۔

سترہ افسانوں پر مشتمل ان کے اس مجموعے میں متعدد ایسی کہانیاں ھیں جو فکر و فن کے اعتبار سے بھی یاد رکھی جائیں گی۔ "بونسائی"، "گردش ایام"، "دیواریں"، "لوٹ پیچھے کی طرف" "مہاجر" اور "بیچ کا آدمی" ایسی ھی قابل قدر کہانیاں ھیں، جو اُردو افسانہ نگاروں کے جمِ غفیر میں تسنیم کوثر کو ایک منفرد اور مُمتاز مقام عطا کریں گی۔

محمد غفار صدیقی

THE SOUND OF WOMEN'S VOICES

An Evaluation Of Women's Writing In India With Profiles Of A Few Select Writers

CONFIDENCE SPEAKS

BY

MEENA SINHA

Tasneem Kausar has carved out a niche for herself in the realm of Urdu litrature but she is also one of the reasons why the urdu news of Patna Doordarshan from amongst eight 'kendras' which telecast Urdu news has recieved rave reviews.

TASNEEM KAUSAR

Hailing from a small village Haidar Nagar in Purnea district Bihar. Tasneem was married at the young age of 17. Motherhood followed. However, she never let early marriage and motherhood beacme a handicap. Right from the days when she used to listen to her grandma's stories. Tasneem had the feeling that she too could easily write stories like those narrated by her grandmother. Today she has articles & stories published in a number of prestgious Urdu magazines like Aiwan-i-Urdu of Delhi Urdu Academy 'Zuban-O-Adab' 'Mirrikh', 'Gulban', 'Pindar' & Lam'at, Patna she has also broadcast her stories the first of which was "Dil Reza Reza". Her first literary creation had for its subject the absence of light because of loadshedding, a common occurence in Bihar. Her stories 'Quaid-e-Hayat', 'Bonsai' and 'Laut Pichhe Ki Taraf' have also received great critical acclaim.

Literature is her passion, history her career and news-reading her hobby. Tasneem has just completed her postgraduation in history and plans to do her doctorate in it. For her history feeds literature so there is no dichotomy between the two. Reading news on T.V. was something that just happened. Literature polished her vocabulary and reading her stories prepared her to be one of the best news-readers.

Reproduced with thanks from **FEMINA**, May 8, 1993

نام : تسنیم کوثر

تاریخ پیدائش : ۳۰ مئی ۱۹۶۷ء

تعلیم : ایم۔اے (تاریخ)، ایم۔اے (اردو) پٹنہ یونیورسیٹی پٹنہ۔

شوہر کا نام : محمد انوار الحق تبسم، ریڈر و صدر شعبۂ تاریخ، اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی، پٹنہ

بچے : دو لڑکے، عرفان انوار اور عمران انوار

وطن : حیدر نگر، پورنیہ (بہار)

مشاغل :
- دور درشن کیندر، پٹنہ اور آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ میں نیوز کاسٹر
- اردو اور ہندی زبانوں میں افسانے، ڈرامے اور مختلف موضوعات پر مضامین ملک اور بیرون ملک کے ادبی رسالوں اور مقامی اردو اور ہندی اخباروں میں شائع اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے اردو سیکشن سے نشر ہوئے۔
- تاریخ و تحقیق سے خصوصی دلچسپی: انڈین ہسٹری کانگریس کے ۵۵ ویں سیشن منعقدہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ (۱۹۹۴ء) میں ایک مقالہ پیش کیا، عنوان تھا:

The Kulahiyas (Some Aspects of their History & culture)

اور پروفیسر سید حسن عسکری مرحوم کی یادوں پر مشتمل ہندی میں ایک طویل مضمون جو زیر اشاعت ہے۔

رابطہ : بیت المکرم، ڈاکٹر محمود شاہ لین، دریاپور گولہ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

Rrice : Rs. 100.00